ماس اور مٹی
محمد منشا یاد

محمد منشا یاد

پیدائش : ۵ ستمبر ۱۹۳۷ء — ضلع شیخوپورہ

تعلیم : ایم اے اُردو

ایم اے پنجابی

ڈپلوما سول انجینئرنگ

پیشہ : سول انجینئرنگ

کتابیں : بند مُٹھی میں جُگنو — ماس اور مٹّی

ماڈرن بُک ڈپو آبپارہ اسلام آباد

ماس اَوَ مِٹّی

ماس اور مٹی

افسانے

محمد منشا یاد

ماڈرن بک ڈپو آبپارہ اسلام آباد

بار اول : ——— مئی ۱۹۸۰ء
تعداد اشاعت : ——— ایک ہزار
ناشر : ——— سید ذاکر شاہ۔ ماڈرن بک ڈپو آبپارہ اسلام آباد
طابع : ——— برق سنز اسلام آباد
کتابت : ——— محمد اسلم چیمہ
سرورق : ——— اسلم کمال
قیمت : ——— ۲۵ روپے

اِنتسَابْ

فرحت اور کاشی کے نام

سب سے پہلے حمد اس رب کی جس کی قدرتوں کا کچھ شمار نہیں۔ اس نے لاکھوں، کروڑوں دنیائیں، کہکشائیں اور چاند سورج پیدا کئے۔ اُس نے دس لاکھ میل قطر کا سورج بنایا اور اسے کائنات میں ایک نقطے کی حیثیت بخشی۔

اُس نے اربوں، کھربوں ایسے ستارے بنائے جن میں سے بعض کی روشنی ہم تک لاکھوں سالوں میں پہنچتی ہے۔

پھر درود اس نبیؐ پر جس نے بادشاہوں کو فقیری اور فقیروں کو بادشاہت دے کر ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا اور اس نے ان کی عقلوں سے پتھر ہٹا کر اپنے پیٹ پر باندھ لئے۔

پھر سلام روشنی کے ان میناروں پر جنہوں نے باطل کا ساتھ نہ دیا اور حق کی خاطر اپنی گردنیں کٹوائیں اور کھالیں اتروائیں۔

پھر رحمت ان عظیم لوگوں پر جنہوں نے فضا میں ایتھر، زمین میں تیل اور ایٹم میں الیکٹرون پروٹون دریافت کئے۔

آخر میں شاباش ان بہادروں کو جنہوں نے ہر حال میں زندگی کا سفر جاری رکھا اور اس رب کا جس کا ذکر اوپر آیا ہے لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

(ماس اور مٹی)

ترتیب

۱۔	رات سمندر ہیں	۱۱
۲۔	کچی پکی قبریں	۱۹
۳۔	پانی میں گھرا ہوا پانی	۲۷
۴۔	اپنا گھر	۳۷
۵۔	باگھ بگھیلی رات	۴۳
۶۔	ماس اور مٹی	۵۱
۷۔	گھر سے باہر ایک دن	۵۹
۸۔	نئی دستک	۶۷
۹۔	اوور ٹائم	۷۵
۱۰	(ا + ب)۲	۸۳
۱۱۔	پے اِنگ گیسٹ	۸۹
۱۲۔	بانجھ ہوا میں سانس	۹۵
۱۳۔	اندھیرے سے اندھیرے تک	۱۰۱
۱۴۔	زوال کے اسباب	۱۰۵
۱۵۔	خواہشیں سراب ہیں	۱۰۹
۱۶۔	بچھڑے ہوئے ہاتھ	۱۱۳
۱۷۔	خواب در خواب	۱۲۱
۱۸۔	رکی ہوئی آوازیں	۱۲۷
۱۹۔	۱۹۷۸ء کا آخری افسانہ ــــ پناہ	۱۳۷

راستے بند ہیں

وہ میلہ دیکھنے آیا ہوا ہے اور اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں۔

میں اس سے پوچھتا ہوں۔

"جب تمہاری جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی تو تم میلہ دیکھنے کیوں آئے ہو؟"

وہ پہلے روتا اور پھر ہنستا ہے اور کہتا ہے۔

'میں میلے میں نہیں آیا ___ میلہ خود میرے چاروں طرف لگ گیا ہے اور میں اس میں گھر گیا ہوں۔ میں نے باہر نکلنے کی کئی بار کوشش کی ہے مگر مجھے راستہ سجھائی نہیں دیتا۔'

مجھے اس کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اس لئے میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ کیونکہ میں اس کی نگہداشت پر مامور ہوں۔ مجھے پتہ نہیں مجھے اس کی نگہداشت پر کس نے مامور کیا ہے؟ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھے ہر وقت اس کے ساتھ رہنا اور اُسے بھٹکنے سے بچانا ہے۔

میلہ زوروں پر ہے۔

چاروں طرف انسان ہی انسان نظر آتے ہیں جتنے لوگ میلے سے جاتے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ آجاتے ہیں۔ سڑکوں پر ہر طرف تانگے، بیل گاڑیاں، بسیں، ٹرک، کاریں اور موٹر سائیکلیں ایک دوسری سے آگے نکلنے کی ناکام کوشش کرتی۔ ہارن بجاتی، دھواں اڑاتی نظر آتی ہیں۔ ہارن بجا بجا کر ڈرائیوروں کے اور مسلسل گھنٹیاں بجا بجا کر سائیکل سواروں کے ہاتھ تھک گئے ہیں۔ پیدل چلنے والوں کے چہرے دھول سے اٹے

ہوئے ہیں اور کپڑوں پر گرد جمی ہے لیکن میلے کے شور نے ان کے تھکے ہوئے نڈھال جسموں میں نئی رُوح پھونک دی ہے۔ میلے کی فضا کو دھوئیں، گرد اور شور وغل کے بادلوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔ بڑے بڑے لاوڈ سپیکروں پر انسانی آوازیں گرجتی اور چنگھاڑتی ہیں۔ بھولوں کی چیخیں۔ ڈھولوں کی گھمکاریں، مداریوں کی بانسریوں کی کوکیں اور خوانچہ فروشوں کی صدائیں ایک دوسری میں خلط ملط ہو رہی ہیں۔ ان سینکڑوں قسم کی آوازوں کے شور میں اسے سوڈا واٹر کی بوتل کھلنے کی ٹک جیسی آواز سب سے اچھی لگتی ہے وہ اسے کسی سُریلے نغمے کی طرح سُنتا اور چاٹتا ہے۔ میں نے کئی بار چلا چلا کر اسے آگے بڑھنے کے لئے کہا ہے مگر وہ سوڈا واٹر کی بوتلوں کی دوکان کے سامنے پتھر ہو گیا ہے۔ میرے لئے عجیب مشکل ہے۔ کاش میں اس سے علیحدہ ہو سکتا، اُسے اس کے حال پر چھوڑ کر جا سکتا۔ میں اس کی کمینی حرکتوں سے عاجز آ گیا ہوں۔ عجیب ندیدہ آدمی ہے۔ صبح وہ کتنی ہی دیر تک اسی بھٹی کے قریب کھڑا جھکتا رہا جس پر پوریاں تلی جا رہی تھیں اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں، وہ بار بار جیب میں ہاتھ ڈالتا پھر خالی ہاتھ کو یوں گھورتا جیسے اُس کی ہتھیلی پر گرم گرم پوری رکھی ہو۔ عجیب واہیات انسان ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے آدمی کے سامنے اکڑوں بیٹھے کُتے کی آنکھ میں بھی اتنا ندیدہ پن نہیں ہوتا، جتنا حلوا پوری کھاتے اور فالودہ پیتے لوگوں کو دیکھ کر اس کی نگاہوں سے جھلکنے لگتا ہے۔ وہ میلہ دیکھنے آیا ہے۔

اور میلے میں دیکھنے کی سینکڑوں چیزیں ہیں۔ تھیٹر کے مسخرے، ناچتی گاتی عورتیں۔ سرکس کے جانوروں کے کرتب، موت کے کنویں میں چلتی موٹر سائیکل اور چلانے والے کی گود میں بیٹھی ہوئی لیڈی، اُوپر نیچے جاتے جھُولے۔ فلم کی ٹاکی پر دو گانے گاتے ہوئے عاشق و معشوق اور مداری کے توپ چلاتے طوطے لیکن اسے ان میں سے کسی چیز سے دلچسپی نہیں حالانکہ سرکس کے باہر فلمی ریکارڈوں کی دھنوں پر ناچتے مسخروں کو دیکھنے پر تو خرچ بھی کچھ نہیں آتا۔ مگر اُسے صرف کھانے پینے کی چیزوں سے دلچسپی ہے۔ اُسے پھلوں، مٹھائیوں، فالودوں، آئس کریموں، سوڈا واٹر کی بوتلوں اور سیخوں میں پروئے ہوئے مرغوں کو دیکھنا۔ گھُورنا اور ان کی خوشبو سونگھنا اچھا لگتا ہے اور حالانکہ دونوں وقت پیر صاحب کے ڈیرے پر اُسے بھنڈارے کی دال روٹی مل جاتی ہے لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ رات وہ مجھے دیر تک ان مٹھائیوں، پھلوں اور چیزوں کے نام گنواتا

رہا جو اس نے کبھی نہیں چکھی تھیں۔ یہ فہرست اتنی طویل تھی کہ میں اکتا گیا اور اُسے مشورہ دیا کہ وہ صرف ان چیزوں کے نام بتائے جن کے ذائقے سے وہ آشنا تھا۔ لیکن وہ رضامند نہ ہوا۔ اُس کا کہنا تھا کہ وہ لذیذ چیزوں کے ذکر سے حاصل ہونے والی لذّت سے محروم ہونا نہیں چاہتا۔

میلے میں اس کی جان پہچان کے اور لوگ بھی ہیں۔

الٰہی بخش نمبردار کا لڑکا عاشق ہے جو اپنے یار دوستوں کے ہمراہ اپنے یکّے پر آیا ہے اور اس کے ڈیرے پر ہر وقت مجرا ہوتا رہتا ہے اور شراب کی بوتلیں خالی ہوتی رہتی ہیں۔ طوائفیں سَروں پر رکھے اور دانتوں سے پکڑے ہوئے نوٹ چُن چُن کر تھک جاتی ہے۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا ہے کہ وہ عاشق کے ڈیرے پر چلا جائے۔ لیکن میں نے اُسے منع کر دیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ وہاں دن رات چلمیں بھرتا رہے۔ پھر سردار محمد تھانیدار ہے اُسے اعتباری آدمیوں کی ضرورت بھی ہے لیکن میں نے اسے سردار محمد کے پاس جانے سے بھی منع کر دیا ہے۔ علیا نائی اپنے حال میں مست ہے۔ وہ میلے میں خالی ہاتھ نہیں آیا اپنے ساتھ رچھانی لیتا آیا ہے۔ اس کا جب جی چاہتا ہے حجامتیں بنانے لگتا ہے اور جب جی چاہتا ہے تھیٹر دیکھنے چلا جاتا ہے۔ تھیٹر دیکھتے ہوئے بھی وہ قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کے ناخن تراشتا رہتا ہے۔ صرف مہرو سانسی ایک آدمی ہے جو اُسے دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور خوشی کے اظہار کے لئے جب بھی سامنے آتا ہے دانت نکالتا ہے یا پھر کالو ہے جو اُسے دیکھتے ہی دُم ہلانے لگتا ہے حالانکہ اس نے زندگی بھر اُسے سوکھی روٹی کا ٹکڑا تک نہیں ڈالا۔

اُسے مہرو سانسی اچھا لگتا ہے شاید اس لئے کہ مہرو گندی چھوٹی چیزیں سہی ہر طرح کی کھانے پینے کی چیزوں کے ذائقوں سے آشنا ہے۔ پچھلی بار تو اس نے حد ہی کر دی تھی۔ رات کو جب اچانک آندھی آ گئی تو وہ کالو کے ساتھ پناہ لینے کے لئے ایک تخت پوش کے نیچے گھس گیا، تخت پوش کے نیچے تلاقند سے بھری کڑاہی رکھی تھی جسے اُس نے اور کالو نے خالی کر دیا۔ اس دوران مہرو کو باہر نکل کر دو بار گلے میں اُنگلی ڈال کر قے کرنا پڑی تھی۔ اگر کالو کی دُم اس کے پاؤں کے نیچے نہ آ جاتی تو ایک آدھ بار اور قے کر کے وہ گلاب جامنوں کا بھی صفایا کر دیتا۔ اُسے مہرو اور کالو پر رشک آتا تھا اگر میں اس کے ہمراہ نہ ہوتا یا اس سے بے پرواہ ہو کر سو یا رہتا تو وہ یقیناً بھٹک جاتا ــــــ چلمیں بھرتا ــــــ دلالی کرتا یا پھر کسی تخت پوش کے نیچے گھس کر تلاقند یا گلاب جامنیں

کھا رہا ہوتا۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا ہے کہ کسی حلوائی کی دوکان یا کسی ہوٹل میں گھس کر جی بھر کے کھائے اور خود کو دکان دار یا پولیس کے حوالے کر دے۔ لیکن میں نے ہر لمحہ اسے ایسی حرکتوں سے باز رکھا ہے۔

میلے کا آج تیسرا روز ہے۔

اور میں نہایت مشکل میں ہوں۔

وہ بغاوت پر آمادہ ہے۔

مجھے اس کے تیور بگڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سوڈا واٹر کی بوتل کھلنے کی "ٹھک" جیسی آواز سن کر اس کی تشفی نہیں ہوتی۔

وہ حلوہ پوری، تلاقند اور بالوشاہی کے ذکر سے مطمئن نہیں ہوتا۔

بھنے ہوئے گوشت اور روسٹ مرغ کی خوشبو سے اس کا جی نہیں بہلتا۔ اور وہ پھلوں کے نام گنوا کر لذت حاصل کرنے پر قناعت نہیں کرنا چاہتا۔

میں نے اسے بہت سمجھایا ہے۔ لعن طعن اور ملامت کی ہے لیکن وہ مصر ہے کہ وہ ہر قیمت پر ان سب چیزوں کو چکھ کر دیکھنا چاہتا ہے جن کے ذائقے سے وہ ناآشنا ہے گذشتہ رات ہم دونوں دیر تک لڑتے جھگڑتے رہے ہیں۔ میں نے اُسے صاف صاف بتا دیا ہے کہ اگر وہ باز نہ آیا تو مجھے زندہ نہ دیکھے گا۔ لیکن اس کا کہنا ہے کہ اگر اس نے اپنی خواہش کا گلا گھونٹ دیا تو گھُٹ کر مر جائے گا۔

میں عجیب اُلجھن میں ہوں۔ شاید وہ وقت آ گیا ہے۔ جب ہمیں فیصلہ کرنا ہو گا کہ ہم دونوں میں سے کسے زندہ رہنا چاہیئے۔

میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔

لیکن میں اُسے بھی زندہ، خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اس کی توجہ ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں اور اسے مداری کے کرتب، جھولوں کے مناظر اور مسخروں کے ناچ دکھانا چاہتا ہوں لیکن وہ قیمہ کریلے، بھنے ہوئے گوشت روسٹ مرغ اور تلاقند کے ذائقوں کے لئے قتل و غارت پر اُتر آیا ہے۔

وہ کہتا ہے "جب یہ سب چیزیں موجود ہیں تو میں ان کے ذائقوں سے محروم کیوں ہوں"

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں اُسے کیسے سمجھاؤں اور بھٹکنے سے کیسے بچاؤں ؟ میلے کا آخری اور چوتھا روز ہے۔

رات مجھے ایک نہایت اچھوتا خیال سوجھا ہے اور میں نے بڑی مشکل سے یہ بات اس کے ذہن نشین کرائی ہے کہ اصل میں سب انسان ایک ہی انسان کا پرتو ہیں یا اصل میں انسان ایک ہی ہے جو مختلف شکلوں میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ کہیں وہ تلا قند کھا رہا ہے۔ کہیں ناخن تراش رہا ہے۔ کہیں روسٹ مرغ اڑا تا ہے اور کہیں بھنڈارے کی دال روٹی پر اکتفا کرتا ہے۔ اس لئے جو کچھ بھی دُنیا میں ہو رہا ہے یا کھایا پیا جا رہا ہے اس کی لذت انسان کی مشترکہ لذت ہے۔ چنانچہ جب وہ کسی کو حلوہ پوری کھاتے دیکھتا ہے تو اسے محسوس کرنا چاہیئے کہ خود حلوہ پوری کھا رہا ہے اور اس لذت میں برابر کا حصّہ دار ہے۔

مجھے اس کی یہ عادت بے حد پسند آئی ہے کہ جب اس کے ذہن میں کوئی بات بٹھا دی جائے تو وہ اس سے سر مُو اِدھر اُدھر نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس نے جلد ہی میری اس انوکھی تجویز پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔

"ٹپک" بوتل کھُلنے کی آواز آتی ہے ۔

ایک تپلا دُبلا آدمی بوتل منہ سے لگاتا ہے ۔ وہ اپنی جگہ کھڑا مسکرا کر میری طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

"واہ وا ـــــــ کیا ٹھنڈی ٹھار اور مزے دار بوتل ہے۔" پھر آستین سے مُنہ پونچھ کر کہتا ہے "مزا آ گیا۔" سیخ کبابوں کی خوشبو لپکتی ہوئی آتی ہے۔ اور اس کے قدم روک لیتی ہے۔

وہ منہ کھولے بغیر تکوں کو دانتوں سے کاٹتا ہے چباتا ہے۔ پھر ان کی لذت محسوس کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"ذرا سخت ہیں مگر گوشت سخت ہی ہو تو مزا دیتا ہے۔"

میں اطمینان کا سانس لیتا ہوں۔

اس کی نظریں بالوشاہی کے تھال پر ہیں۔ وہ دوکان سے کچھ فاصلے پر کھڑے کھڑے بالوشاہی کھانا شروع کر دیتا ہے۔ کھاتے کھاتے اس کا مُنہ تھک جاتا ہے۔ پیٹ پھول جاتا ہے مگر بالوشاہی ختم ہونے

کا نام نہیں لیتے۔ میں کہتا ہوں "اور کھاؤ۔"

"نہیں بس" وہ ڈکار لیتے ہوئے جواب دیتا ہے۔ پاپڑ دیکھ کر میں کہتا ہوں۔

"منہ سلونا کروگے؟"

"ہاں ــــ"

پاپڑ اس کے دانتوں تلے کڑکڑاتے ہیں۔

"کیسے ہیں؟"

"بہت اچھے ہیں بس ذرا مصالحہ تیز ہے۔"

"اور کیا پسند کروگے؟"

"میں نے آج تک سیب نہیں چکھا۔"

میں اسے پھلوں کی دوکان کے سامنے لے جاتا ہوں اور سیبوں کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہوں۔

"یہ سیب ہیں تم جتنے چاہو کھا سکتے ہو۔"

وہ ایک سیب ننگا ہوں سے اٹھاتا ہے دانتوں سے کاٹتا ہے اور کہتا ہے۔

"یہ تو ناشپاتی ہے۔"

"یہ ناشپاتی نہیں سیب ہے تم اسے سیب کی طرح محسوس کر کے کھاؤ۔"

وہ پھر دانتوں سے کاٹتا ہے اور کہتا ہے "یہ امرود ہے"۔

"یہ امرود نہیں سیب ہے۔"

وہ پھر کوشش کرتا ہے پھر کہتا ہے۔

"یہ آڑو ہے" ــــــــــ

"یہ آڑو نہیں ہے" ــــــــــ

مجھے غصّہ آجاتا ہے ــ

"تم اُلّو کے پٹھے ہو" ــــــــ

وہ مجھے اُداس نظروں سے دیکھتا ہے پھر روہانسا ہو کر کہتا ہے :۔

"مجھے کیا پتہ سیب کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے میں نے کبھی کھایا ہی نہیں "

"اچھا چھوڑو "

میں کہتا ہوں

"اب آگے چلتے ہیں"

ہم باری باری ایک دوسرے کی اُنگلی پکڑ کے چلنے لگتے ہیں۔ ایک جگہ بہت سے لوگ جمع ہیں۔

"کیا بات ہے بھائی" ؟

وہ پوچھتا ہے

"حادثہ ہو گیا۔ آدمی ٹرک کے نیچے آ کر کچلا گیا"

وہ پریشان ہو کر میری طرف دیکھتا ہے

پھر کہتا ہے :

"ٹرک میرے اوپر سے ٹرک گذر رہا ہے !"

"نہیں ۔ میں چلاتا ہوں

لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہوں وہ دھڑام سے نیچے گر جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈا

ہو جاتا ہے

کچی پکّی قبریں

وہ اکیلا قبرستان کے ایک کونے میں اپنی آبائی جھونپڑی میں رہتا ہے۔

اسے قبرستان میں رہتے ہوئے کبھی ڈر نہیں لگا۔ وہ انہی قبروں کے درمیان کھیل کُود کر بڑا ہوا ہے۔ وہ بچپن میں خود بھی چھوٹی چھوٹی قبریں بنا کر ننھّے مُنّے مٹّی سے بنائے ہوئے مُردے کفنایا اور دفنایا کرتا تھا اسے یہ جگہ جنّت کا ٹکڑا معلوم ہوتی ہے۔ نہر کی وجہ سے جھونپڑی کے قریب والے کنوئیں کا پانی بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ قبرستان میں ہر طرف شیشم اور کیکر کے اُونچے اُونچے درخت ہیں جن کی چھال اور ٹہنیوں کی آگ سے چلم پہروں گرم رہتی ہے اور قبروں کے درمیان جابجا بُوٹی اُگی ہوئی ہے جس کے چند پیالے پی کر اسے عرش کے کنگرے نظر آنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی اس کا جی چاہتا ہے ساری بُوٹی کاٹ اور پیس کر کنوئیں میں ڈال دے اور اس میں کُود جائے۔ قبرستان میں اسے بہت آرام ہے۔ رُوحیں اس پر رعب نہیں جماتیں یا زیرِ حس نہیں کرتیں اور مُردے اس سے بیگار نہیں لیتے۔

اسے کالو اور ڈُبّو سے بڑی محبّت ہے۔

اور اسے اس بات پر بڑا فخر ہے کہ اس نے ان کے بے حد مناسب نام رکھے ہیں کالو بالکل کالا ہے اور ڈُبّو ڈُب کھڑبا۔ لیکن اسے اپنا نام کچھ زیادہ پسند نہیں۔ جب وہ چھوٹا تھا تو اس کا نام کچھ اور تھا پھر جب چلتے وقت اس کے ٹخنے آپس میں ٹکرانے لگے تو اس کی ماں نے دھاگے میں پرو کر ایک کوڑی ککوڑی اس کے ٹخنے سے باندھ دی اور اس کا نام کوڈُو پڑ گیا۔

کالوا اور ڈبّو ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتے ہیں اور جب وہ بوٹی پی کر قبروں کے درمیان گھاس پر یا جھونپڑی میں سوتا یا اونگھتا ہے تو وہ اس کی نگرانی کرتے ہیں۔ اس کا باپ بہت سخت تھا مگر اسے اپنے باپ سے بھی محبت ہے۔ بوٹی پیتے ہوتے اسے اکثر اپنا باپ یاد آجاتا ہے اور وہ بھنگ کے دو ایک پیالے اس کی قبر پر بھی انڈیل آتا ہے۔

جمعرات کے روز چودھری بخشے کے ہاں گڑ کے میٹھے چاول پکتے ہیں جن کی خوشبو حویلی سے قبرستان تک پھیل جاتی ہے۔ وہ ہر روز صبح سویرے بھیک مانگنے کے لئے گاؤں جاتا ہے لیکن جمعرات کو تیسرے پہر مانگنے کے لئے نکلتا ہے اور کالو اور ڈبّو کو ساتھ لئے بھیک کے لمبے لمبے تھیلے لٹکائے گلی گلی گھومتا اور صدا لگاتا ہے۔

"جمعرات کا نیک دیہاڑا ہے مومنو۔ ساری نیک روحیں ثواب کی آس لے کر اپنے وارثوں کے دروازوں پر کھڑی ہیں۔ قبرستان کا فقیر کوڈو بھی آپ کے دروازے پر آیا ہے اور ہاتھ جوڑ کر سلام کرتا ہے اور دعا دیتا ہے دھن بھاگ ہوں۔ آل اولاد کا صدقہ۔ مال وجان کی خیر۔ اونچے محل ماڑوں کی خیر۔"

سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے ساری روحیں قطار اندر قطار قبرستان میں واپس آجاتی ہیں کوڈو ان سے پہلے قبرستان پہنچ جانا چاہتا ہے اسے ڈر رہتا ہے کہ جھونپڑی کے دروازے پر کھڑی اس کے ماں باپ اور دادا کی روحیں مایوس ہو کر لوٹ نہ جائیں۔ ماں کو تو وہ گڑ کے میٹھے چاولوں سے منا سکتا ہے لیکن اس کے باپ کی طرح اس کی روح بھی نہایت ضدی اور غصیلی ہوگی۔ دیر ہوگئی تو گالیاں بکتی اور پاؤں پٹختی واپس چلی جائے گی اور بوٹی کے پیالوں سے بھی خوش نہیں ہوگی۔ دادا کی اسے زیادہ پرواہ نہیں۔ دراصل اس نے اپنے دادا کو دیکھا ہی نہیں ویسے بھی اسے بوڑھوں سے نفرت ہے سارا قبرستان ان سے پٹا پڑا ہے۔

جمعرات کو شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی چند پختہ قبروں پر اگر بتیاں سلگتی اور سرسوں کے تیل کے دیئے جلتے نظر آنے لگتے ہیں۔ قرآن خوانی ہوتی ہے اور فاتحہ پڑھی جاتی ہے کھاتے پیتے سعادت مند بیٹے اپنے ماں باپ اور مالدار بیوائیں اپنے شوہروں کی قبروں پر آتی ہیں لوگ دیئے جلا کر اور کوڈو کو قبروں کی دیکھ بھال کی تاکید کر کے چلے جاتے ہیں تو کوڈو کے اندر کوئی چیز سلگنے لگتی ہے۔ کبھی کبھی اسے قبروں کے

درمیان ٹیڑھے میڑھے راستوں پر گاؤں کی تنگ اور پُرپیچ گلیوں کا گمان ہونے لگتا ہے۔ بڑے لوگوں کی قبریں پختہ اور بڑی ہیں غریب اور نادار لوگوں کی قبریں کچی اور بے نشان ہیں زمینداروں اور چودھریوں کی پختہ قبریں ان کی حویلیوں کی طرح اچھی اور بلند جگہوں پر ہیں۔ دُور ہی سے پہچانی جا سکتی ہیں، اور ان میں سے بعض پر دیئے جلانے کے لئے طاقچے بنے ہوئے ہیں اور سنگِ مرمر کی لوحیں نصب ہیں۔ مزارعوں اور کمی کمینوں کی قبریں نم آلود اور نشیبی جگہوں پر ہیں بعض پر لمبی لمبی گھاس اور بوٹی اُگی ہوئی ہے اور بعض بالکل ہموار ہو چکی ہیں۔ ان کے وارث کام کاج میں پھنسے بستے ہیں اور کبھی سال میں ایک بار محرّم کے مہینے میں آتے اور کوڈو کی نشاندہی پر قبروں کو شناخت کرتے اور روڑ مٹی ڈالتے ہیں۔

پہلے پہلے کوڈو کو پختہ قبروں کے طاقچوں میں جلتے ہوئے دیئے اور اگربتیاں دیکھ کر اپنے ماں باپ کی مفلسی اور بے کسی پر ترس آتا اور دُکھ ہوتا تھا مگر اب قبرستان میں اندھیرا پھیلتے اور لوگوں کے رُخصت ہوتے ہی وہ پختہ قبروں سے دیئے اٹھا کر اپنے ماں باپ کی قبروں پر رکھ دیتا ہے۔ ماں باپ کی قبروں پر جلتے ہوئے دیئے دیکھ کر اسے بڑا سکون ملتا ہے اور وہ اپنی اس سعادت مندی پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا ہے کئی بار اس کا جی چاہا ہے کہ وہ پختہ قبروں سے اینٹیں نکال کر اپنے ماں باپ کی قبریں بھی پختہ بنا دے لیکن اس طرح اسے پکڑے جانے، قبرستان سے نکال دیئے جانے اور خیرات بند ہو جانے کا ڈر ہے ایک دفعہ اس نے اپنی ماں کی قبر پر شیشم کا پودا لگایا تھا تو چودھری فضل کے بڑے لڑکے نے مار مار کر اسے ادھ موا کر دیا تھا اس کا خیال تھا کہ اس نے یہ پودا اس کے باپ کی قبر سے اکھاڑا تھا۔ حالانکہ اس نے یہ پودا گاموں ترکھان کی قبر کے قریب سے کھودا تھا۔

رات کو قبرستان میں ٹڈیاں بولتی، مینڈک شور مچاتے اور سانپ شوکتے ہیں۔ وہ بوٹی پی کر ٹوٹی ہوئی چارپائی میں دھنسا حقّہ پیتا رہتا ہے۔ پھر جب کسی چرواہے کی بنسری کی دل چیر دینے والی آواز سنائی دیتی ہے تو وہ دُکھی ہو جاتا ہے اور اپنی بے سُری آواز میں گانے لگتا ہے۔

"اُچیاں محلاں والیئے یاد سے خیر فقیراں نوں"

نُوراں جب سے جوان ہوئی ہے گاؤں کے گھبروؤں کا کام کاج میں جی نہیں لگتا۔ کھیتوں میں ہل چلاتے

ہوتے اور چارہ کاٹتے ہوئے بھی ان کا دھیان گاؤں کی طرف لگا رہتا ہے۔ چرواہے اس کے فراق میں بنسریوں پر درد بھری دُھنیں الاپتے اور کسان ماہیئے، ٹپّے اور ابیات گاتے ہیں۔

الف آ پیار دیا لگ سینے

اُڈیاں نی کونجاں وچ اک ساڈی کونج لے

اور حالانکہ وہ گھر سے باہر بہت کم نکلتی ہے اور چودھری بخشے کی حویلی میں پرندہ پر نہیں مار سکتا مگر اس کے حسن و جمال کی دھوم بارہ بارہ کوس تک پھیل گئی ہے اس کے بے شمار عاشق اور پرستار پیدا ہو گئے ہیں اور بڑی دور دور سے اونچے گھرانوں کے رشتے آ رہے ہیں۔ کوڈو بھی اس کے پرستاروں میں سے ایک ہے۔ کہتے ہیں کہ جب یوسف علیہ السلام کا نیلام ہونے لگا جس کے پاس جو کچھ تھا لے دوڑا ایک بڑھیا سوت کی ایک اٹی لے کر آ گئی تھی۔

کوڈو فقیر سارے عاشقوں اور پرستاروں سے زیادہ خوش نصیب ہے وہ بھیک مانگنے کے لئے ہر روز چودھری بخشے کی حویلی میں جاتا اور نوراں کا دیدار کرتا ہے ماں کے مرنے کے بعد اس نے روزانہ گاؤں جانا اور مانگنا چھوڑ دیا تھا صرف جمعرات کے روز جاتا تھا مگر جب سے عشق کی آگ سے اس کا اندر دہکنے لگا ہے اس نے پھر ہر روز جانا اور مانگنا شروع کر دیا ہے۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہی اس کا جی مچلنے لگتا ہے کہ جلد از جلد چودھری بخشے کی حویلی کے دروازے پر پہنچ کر صدا لگائے مگر وہ اپنی خواہش کے منہ زور گھوڑے کی لگامیں بار بار کھینچتا اور حساب لگاتا رہتا ہے کہ اب وہ دودھ بلو رہی ہو گی اب وہ برتن دھو رہی ہو گی اور اب وہ روٹیاں پکا رہی ہو گی۔

کبھی کبھی اسے چودھری بخشے کے گھر کی گلی میں داخل ہوتے وقت خوف سا آنے لگتا ہے اور وہ خود سے کہتا ہے۔ طوطیا۔ من موطیا۔ کوڈو فقیرا، باز آ۔ اس گلی میں نہ جا۔ اس گلی کے لوگ ظالم ہیں تجھے پھاہی (پھندا) پا لیں گے۔

اندھیری راتوں میں قبرستان میں خاموشی چھائی رہتی ہے اور جھینگروں کے بولنے، مینڈکوں کے ٹرانے اور سانپوں کے شوکنے کی آوازیں بھی سنائی نہیں دیتیں تو اسے لگتا ہے کہ وہ بھی مر چکا ہے اور کسی کچی ٹوٹی ہوئی

قبر میں بے حس و حرکت پڑا ہے لیکن کبھی کبھی چاندنی راتوں میں گھنگھروں کی جھنکار سن کر اچانک اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ کالو اور ڈبو بھرٹے کی نم آلود جگہ پر لیٹے ہوتے اونگھ رہے ہوتے ہیں ——————

اور قبرستان کے عین وسط میں الاؤ کے گرد بے کفن جوان عورتیں محو رقص ہوتی ہیں ہوا کے جھونکے درختوں کی ٹہنیوں سے ٹکرا کر سارنگیاں بجاتے ہیں درختوں کے پتے آپس میں ٹکرا کر تال دیتے ہیں اور اپنی اپنی قبر سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تماشائی مُردے تالیاں بجا بجا کر داد دیتے ہیں اور وہ اپنے میلے بدن پر مچھروں کے کاٹنے کی جگہوں کو بے دردی سے کھجلاتا، کڑوے تمباکو کے گہرے کش لیتا اور رات رات بھر جھومتا رہتا ہے۔

دن کو وہ بوٹی کے چند پیالے پی کر نہر کے کنارے جا بیٹھتا ہے اور اسے ہر چیز سبز نظر آنے لگتی ہے۔ نہر کا سبز رنگ کا پانی دیکھ کر اس کا جی چاہتا ہے کسی بڑے ماجبار کے موگھے کی طرح ڈیک لگا کر نہر کا سارا پانی پی جائے۔ وہ قریبی پُل کے نیچے سے بہتی ہوئی نہر کو دیکھتا ہے تو اسے لگتا ہے جیسے نہر کا پانی پُل کے نیچے سے نہیں بہہ رہا کسی دیو قامت کوڈو کے حلق میں اترتا جا رہا ہے۔ وہ پہروں نہر کے کنارے بیٹھا حقہ پیتا اور خوبصورت خیالوں سے کھیلتا رہتا ہے۔

وہ ایک ایک کر کے سارے کپڑے اُتار دیتی ہے اور نہر کے سبز رنگ کے پانی میں نہانے کے لئے اُترتی ہے وہ کالو اور ڈبو کو منہ دوسری طرف کر لینے کی ہدایت کرتا ہے لیکن خود آنکھیں پھاڑے نہر کے اس پار اُسے پانی میں اُترتے ہوتے دیکھتا رہتا ہے وہ سنہری مچھلی کی طرح تیرتی ہوئی نہر کے وسط میں آجاتی ہے اور اپنا عُریاں بدن چھپانے کے لئے بار بار غوطہ لگا کر تہہ میں چلی جاتی ہے اور وہ اس کے اُوپر آنے کا انتظار کرتا رہتا ہے۔

بعض اوقات وہ کئی کئی روز تک اُوپر نہیں آتی۔

ایک روز کیا دیکھتا ہے کہ چودھری بخشے کی حویلی مہمانوں سے بھری پڑی ہے۔ گھوڑے ہنہناتے اور شہنائیاں بجتی ہیں دیگیں چڑھی ہیں اور کمی کمین بھاگے دوڑے پھرتے ہیں اسے چولہوں میں ایندھن جھونکنے کے لئے کہا جاتا ہے وہ آگے بڑھتا ہے لیکن ٹھٹک کر رہ جاتا ہے دیگوں کے نیچے بڑے بڑے چولہوں میں

لکڑیوں کی جگہ دھڑ دھڑ اس کے بازو اور ٹانگیں جل رہی ہیں گوشت جلنے کی بُو چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ کوڈو فقیرا۔ بدبختا تجھے منع نہیں کیا تھا کہ اس گلی میں نہ جا۔ اس گلی کے لوگ ظالم ہیں ــ!

کیا دیکھتا ہے کہ ٹوکے سے اس کی ہڈیاں کاٹی جا رہی ہیں اور تیز چھُریوں سے اس کی بوٹیاں چیری جا رہی ہیں قریب ہی ایک لڑکا بیٹھا پیاز کتر رہا ہے وہ اپنی بوٹیوں کو ٹٹول کر دیکھتا ہے۔ یہ چانپ ہے، یہ گردن ہے اور یہ پُٹھ!!

ــ اسے پلاؤ میں ڈالا جائے گا۔

ــ اس کا قورمہ پکایا جائے گا۔

ــ وہ اسے دیگ میں ڈال کر اس کے مُنہ پہ ڈھکنا رکھ دیں گے اور اس کا دم گھُٹ جائے گا۔

کوڈو فقیرا۔ بدبختا !!

اس کی چمڑی ادھیڑ کر اس کی ڈھولک بنائی گئی ہے ڈھولک پر جب بھی تھاپ پڑتی ہے۔ اس کی چمڑی دُکھنے لگتی ہے۔ بے چارہ کوڈو فقیر، غریب۔ یتیم۔ بھک منگا، طوطیا۔ من موطیا۔ کوڈو فقیرا۔ بدبختا تجھے کہا تھا نا کہ اس گلی میں نہ جا۔ اس گلی کے لوگ ظالم ہیں تجھے بھا ہی پالیں گے۔

گھوڑے ہنہناتے ہیں۔

شہنائیاں بجتی ہیں۔

اور نوراں کی ڈولی نکلتی ہے۔

"نیلے دسے رانجھیا واہ میں لا رتھکی میرے وسّ بھتیں گل بے وسّ ہو ئی"

دُولہا کا باپ ہجوم پر ریزگاری کا مینہ برساتا ہے۔ لمحہ بھر کے لئے اس کا جسم سُنّ ہو جاتا ہے لیکن پھر سکّے کوڈو کے بدن پر سنگریزوں کی طرح گرنے اور بچھوؤں کی طرح ڈسنے لگتے ہیں۔ وہ انہیں حقارت سے روندتا ہوا قبرستان کی طرف لپکتا ہے اور کُدال اٹھا کر چودھری فضل اور نمبردارنی روشن بی بی کی قبروں کی طرف بڑھتا ہے۔

اگلے روز اس کی آنکھ کھُلتی ہے تو چاروں طرف دھُوپ پھیلی ہوتی ہے اس کے سیاہ اور میلے جسم

پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں اس کے ہاتھ اور سر کے بال دھول سے اٹے ہوئے ہیں اور تھکاوٹ سے اس کا بند بند درد کر رہا ہے۔ پھر اس کی نظر کدال پر پڑتی ہے۔ ایک فاتحانہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل جاتی ہے۔ اسے لگتا ہے نوراں کی ڈولی نکلتے وقت جو کانٹا اسے لہو لہان کر رہا تھا۔ اب اس کے دل سے نکل گیا ہے۔ اسے یہ سوچ کر بڑی طمانیت محسوس ہوتی ہے کہ اب اس کے ماں باپ کی قبروں پر ہر جمعرات کو فاتحہ اور قرآن خوانی ہوگی اور اگر بتیاں سلگتی اور دیئے جلتے رہا کریں گے۔ خوشی اور فتح کے احساس سے اس کا سینہ تن جاتا ہے وہ بوٹی کا پیالہ پیتا ہے پھر خود سے کہتا ہے کوڈو فقیرا۔ فکر نہ کر بدسخنا۔ کون کھود کر دیکھتا ہے اور دیکھ بھی لے تو کون پہچان سکتا ہے امیر اور فقیر سب کی کھوپڑیاں اور ہڈیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔

پانی میں گھرا ہوا پانی

چکنی مٹی سے گھوڑے بیل اور بندر بناتے بناتے اس نے ایک روز آدمی بنایا اور اُسے سوکھنے کے لئے دھوپ میں رکھ دیا ——————

سخت دوپہر تھی، چلچلاتی دھوپ کے شعلے ویران اور کلر زدہ زمین پر جگہ جگہ رقص کر رہے تھے چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ چرند پرند پناہ گاہوں میں چھپ گئے تھے۔ شریہنہ کا بوڑھا پیڑ چپ چاپ دھوپ میں کھڑا جھلس رہا تھا اور زینتاں اب تک روٹی لے کر نہیں آئی تھی۔

اُس نے گاؤں کی طرف سے آنے والے راستے پر دُور دُور تک دیکھا مگر چلچلاتی دھوپ کے سوا اسے کچھ نظر نہ آیا، اس نے چلم کو ٹٹولا وہ گرم تھی، مگر اس نے کش لیا تو اس کے منہ میں جلے ہوئے تمباکو کی بُو کے سوا کچھ نہ آیا —— وہ اٹھ کر سائے میں آگیا اور زینتاں کی راہ دیکھنے لگا۔

ایک مدت سے اس کی خواہش تھی کہ وہ ایک ایسا باوا بنائے جسے کم از کم زینتاں دیکھ کر ضرور دنگ رہ جائے اور اس کی کاریگری کی تعریف کرے۔ اس کے ذہن میں جوانی کے دنوں سے ایسے بہت سے لوگوں کی شکلیں اور قامتیں محفوظ تھیں جن سے وہ کبھی نہ کبھی متاثر ہوا تھا وہ چاہتا تھا دیکھے ہوئے ان بہت سے چہروں اور جسموں کو توڑ کر ان کے خمیر سے ایک نہایت عمدہ قد و قامت اور چہرے مہرے والا آدمی بنائے جو ہر طرح سے مکمل اور نادر ہو۔ اس نے اپنے ذہن میں اسے کئی بار مکمل کیا تھا مگر بار بار اس کی شکل و صورت اور ساخت اس کے ذہن سے اُتر جاتی یا دھندلا جاتی۔ وہ اسے مکمل

یکسوئی اور اطمینان سے بنانا چاہتا تھا، لیکن اطمینان نصیب نہیں ہوتا تھا اُسے ہر گھڑی زیناں کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا۔ کئی ایک بار اس نے کوشش بھی کی مگر پھر اسے ادھورا چھوڑ دیا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ اسے اس وقت یاد آتا جب مٹی کم ہوتی یا اچھی نہ ہوتی اور کبھی اس وقت جب وہ رات کو کھلے آسمان کے نیچے چارپائی پر لیٹ کر حقہ گڑگڑا رہا ہوتا۔ مگر آج گھوڑے، بیل بناتے بناتے اچانک اس کے دل میں درد زہ کی سی ٹیس اٹھی اور اس نے اُسے بنایا اور سوکھنے کے لئے دھوپ میں رکھ دیا۔

بیٹھے بیٹھے اس نے شرینہہ کی سوکھی ہوئی پھلی لے کر مروڑی اور بیج نکال کر گننے لگا، اسے خیال آیا کہ بوڑھے شرینہہ کے سوکھنے یا ٹوٹ جانے سے پہلے دوسرا شرینہہ اُگا دینا چاہیئے لیکن پھر وہ کسی انجانے خیال سے اُداس ہو گیا۔ اُسی لمحے زیناں روٹی لے کر آ گئی، اس نے ہمیشہ کی طرح اطمینان کا سانس لیا پھر گھڑے سے پانی کا پیالہ بھرا اور منہ ہاتھ دھونے لگا۔ زیناں اس کے سامنے بیٹھ کر دوپٹے کے پلّو سے پنکھا کرنے اور نظر نہ آنے والی مکھیاں اڑانے لگی پھر بولی :۔

" تمباکو نہیں ملا ـــــ دکان والا پچھلے پیسے مانگ رہا تھا ـــــــــــــــــ تم کہو تو رنجے سے کچھ ـــــــ "!

" نہیں" اس نے چھاچھ کا پیالہ خالی کر کے رکھتے ہوئے کہا " میں شام کو آ کر خود اس سے بات کر لوں گا فی الحال ایک آدھ چلم ہے .... کام چل جائے گا۔"

" میں تو کہتی ہوں " زیناں شرینہہ کی ڈالیوں سے چھن چھن کر آنے والی دھوپ کو ہاتھ کی پشت پر روک کر بولی دوپہر کو گھر آ جایا کرو ـــــ درخت بوڑھا ہو گیا ہے اور لوگوں نے اس کی ٹہنیاں کاٹ کاٹ کر اسے اور بھی ٹنڈ منڈ کر دیا ہے "

" یہ بڑا برکت والا ہے " اس نے کہا " یہ نہ ہوتا تو بدھائی مانگنے والوں کو گھر تلاش کرنے میں دقت پیش آتی، سارے گاؤں میں یہی ایک تو شرینہہ ہے "

وہ روٹی کھا چکا تو وہ برتن سمیٹنے لگی اسے اچانک کچھ یاد آیا وہ بیقراری سے بولا " زیناں،

Scanned by CamScanner

"میں نے آج ایک کمال کی چیز بنائی ہے۔"

"کیا؟"

"تم بتاؤ"

"مرتبان" وہ بولی "تم نے اچھا کیا جب بھی لسّی مانگنے جاتی ہوں چودھرانی مرتبان کا مزدور پوچھتی ہے۔"

"وہ بھی بنا دوں گا لیکن یہ ایک دوسری چیز ہے"

"اچھا اچھا" وہ ہنس پڑی "مجھے پتہ چل گیا، جھانواں"

وہ بھی ہنس پڑا کہنے لگا "جھانواں" تو نہیں پر ایک لحاظ سے جھانواں ہی سمجھو کیونکہ اس میں عقل تمیز نہیں ہے ــــــ میں نے باوا بنایا ہے۔"

"باوا؟"

"ہاں باوا اور ایسا بنایا ہے کہ بس جان ڈالنے کی کسر رہ گئی ہے تم دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی کہ دنیا میں تم سے زیادہ خوبصورت چیزیں بھی ہیں بنائی جا سکتی ہیں۔"

"اچھا چلو دکھاؤ" وہ اشتیاق سے بولی۔

وہ اُسے لے کر وہاں آیا جہاں اس نے ساری چیزیں دھوپ میں سوکھنے کے لئے رکھی تھیں مگر وہ یہ جان کر نہایت پریشان ہو گیا کہ گھوڑے، بیل، بندر اور سب چیزیں جوں کی توں پڑی تھیں مگر آدمی وہاں نہیں تھا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی دُور دُور تک چلچلاتی دھوپ اور چمکتا ہوا کلر پھیلا ہوا تھا کہیں آدمی نہ آدم زاد ــــ پرندے تک گھونسلوں اور درختوں کی گھنی شاخوں کی تلاش میں نکل گئے تھے وہ پریشان ہو گیا۔

"پتہ نہیں آدمی کدھر گیا"

"سو بار کہا ہے" زینان بولی "دوپہر کے وقت آرام کر لیا کرو مگر تم مانتے ہی نہیں۔ مجھے ڈر ہے کسی روز تم سچ مچ سودائی ہو جاؤ گے۔"

" تمہیں یقین نہیں آیا" وہ شکایت آمیز لہجے میں بولا، " خدا کی قسم میں نے تمہارے آنے سے ذرا پہلے اسے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا، آنکھوں سے بنا ہوا دیکھا اور یہاں رکھا تھا اور ابھی تو وہ اچھی طرح سے سوکھا بھی نہیں تھا"

" کہیں چلا گیا ہوگا" زیتاں نے ہنستے ہوئے کہا" کیا پتہ تمہارے لئے بتا کو لینے گاؤں چلا گیا ہو"

اس نے نظریں جھکالیں اور نڈھال نڈھال سا شرینہہ کے نیچے آگیا، زیتاں کچھ دیر خاموش رہی پھر ناخنوں سے درخت کے تنے کی کھال کھرچتے ہوئے بولی:۔

" تو تم نے سچ مچ باوا بنایا؟"

" اور تو کیا، میں تم سے جھوٹ بول سکتا ہوں؟"

" اگر ایسا ہے تو مجھے ڈر لگ رہا ہے" زیتاں بولی" تم گھر چلو ـــــ دیکھو یہ وقت ٹھیک نہیں ہوتا، ویسے بھی یہ سنسان جگہ مجھے تو بکی معلوم ہوتی ہے۔ ایک دن میں واپس جا رہی تھی تو ٹبے کے پاس سے مجھے ایسا لگا جیسا کسی نے میرا نام لے کر پکارا ہو ـــــ میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہیں تم غلط نہ سمجھو ـــــ" اللہ کی مخلوق"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی، پھر بولی:۔

" پتہ ہے ایک بار ابا گدھے پر سوار کہیں جا رہا تھا اس نے دیکھا اس کے آگے آگے ایک اور شخص بھی گدھے پر سوار جا رہا ہے پھر دونوں غائب ہوگئے آدمی بھی اور گدھا بھی ابا نے اتر کر دیکھا وہاں تک گدھے کے پاؤں کے نشان تھے جہاں سے وہ غائب ہوا تھا"

" میں ایسی باتوں کو نہیں مانتا، وہ بولا" اور پھر انہوں نے باوے کا کیا کرنا تھا؟

" اللہ جانے ـــــ میں تو کہتی ہوں گھر چلے چلو"

" نہیں زیتاں ـــــ میں گھر میں چھپ کر کب تک بیٹھ سکتا ہوں اور پھر تمہیں پتہ ہے مجھے گاؤں ... آدمی ایسا نہیں ہے جو مجھے آدمی سمجھتا

ہونے دے کے ایک رہ گیا ہے وہ بھی تمہاری "______"

" ایسی باتیں نہ کیا کرو دتے" وہ اداس لہجے میں بولی "مجھے پتہ ہے کہ تم نفرتوں کے ستائے اور کئی پشتوں سے محبت کے لئے ترسے ہوئے ہو لیکن میں جو ہوں ____ میری طرف دیکھو ____ میں بھی تو ہوں ____ تم تو پھر دن بھر کھلونوں سے کھیلتے رہتے ہو"

" اور تم نے جو اتنے سارے گھگھو گھوڑے پڑچھتی پر سجا کر رکھے ہوئے ہیں ؟"

" ہاں رکھے تو ہوئے ہیں مگر کیا فائدہ ؟"

" ویسے زیناں ____ میں سوچتا ہوں تمہیں رب نے اتنا حُسن دیا ہے کہ تم محض شیشہ دیکھ کر بھی وقت گزار سکتی ہو"

زیناں کی سمجھ میں نہ آیا کیا کرے ، لجائے ، اترائے یا چوٹ سہلائے کچھ دیر چپ رہ کر بولی

" دتے تم پانی میں گھرے ہوئے پانی ہو تمہیں کیا پتہ آگ کیا ہوتی ہے ؟ تم آوی میں چیزیں پکاتے ہو لیکن تم نے خود آوی میں پک کر کبھی نہیں دیکھا ، مجھے تو ایسا لگتا ہے میں تو آگ میں گھری ہوئی آگ ہوں "

" میں تو تمہیں پہلے ہی ناری سمجھتا ہوں "

" نہ اڑیا ____ مجھے خاکی ہی رہنے دے ____ میں تو ایک بھینس اور ایک گدھی کے عوض "

" بھینس اور گدھی کا ذکر بار بار نہ کیا کرو اگر میرے پاس قارون کا خزانہ ہوتا اور تم مجھے اس کے بدلے مل جاتیں تو بھی میں خود کو خوش قسمت سمجھتا "

" ذکر کیوں نہ کیا کروں ____ بھینس اب تیسرے چوتھے سوئے میں ہوتی اور گدھی "

" تم نہ آتیں تو میرا کیا بنتا ____ برادری والوں نے تو غریب سمجھ کر صاف جواب دے دیا ہوا تھا ____ میرا جنازہ "

" ہاں تمہاری روٹی کون پکاتا ____ کپڑے کون دھوتا اور تمہارا جنازہ ؟" وہ اداس اور پریشان ہو گئی ۔

وہ بولا" اب تم گھر چلی جاؤ ـــــ میں اُسے تلاش کرتا ہوں۔"

"دوسرا بنالو" وہ برتن اٹھاتے ہوئے بولی" آخر ایک باوا ہی تو تھا"

"دوسرا تو میں کسی بھی وقت بنا لوں گا، اس نے جواب دیا" لیکن وہ پہلا کدھر گیا"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو وہ پہلا والا کدھر گیا"

"عجیب بات ہے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا ـــــ کچھ سمجھ میں نہیں آتا"

"کاش میں تمہاری کوئی مدد کر سکتی لیکن میری تو اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، اللہ اپنا فضل کرے ـــــ اچھا میں جاتی ہوں"

وہ اٹھ کر چل دی ـــــ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا، گم صُم کھڑا رہا۔ جب وہ ٹبے کے پاس پہنچ گئی تو اس نے اسے آواز دی۔

"زیناں ـــــ کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا"

مگر زیناں نے مڑ کر نہیں دیکھا وہ اس کی آواز کی حد پار کر چکی تھی اُسے پشیمانی ہونے لگی اس نے زیناں کو پہلے کیوں تاکید نہ کر دی کہ وہ کسی سے اس کا ذکر نہ کرے، لوگ اُسے پہلے ہی بیوقوف اور حقیر جانتے تھے، نئی بات سُن کر اور ہنسی اڑائیں گے اور اس کا جینا دوبھر کر دیں گے۔ پھر اُس نے چشم تصوّر سے دیکھا زیناں گلی کے موڑ پر کسی سے باتیں کر رہی تھی۔

"د مجے ـــــ تیرے بھائیے نے آج آدمی بنایا"

"آدمی بنایا؟"

"ہاں اور وہ غائب ہو گیا"

"کون بھائیا؟"

"نہیں آدمی"

"بھائیا بھی تو آدمی ہے ـــــ کہو ہے کہ نہیں"

"ہے ـــــ مگر اس نے باوا بنایا تھا"

"دیکھ زینی ـــــ بجھارتیں نہ ڈالا کر ـــــ بھایئے کا باوا گم ہو گیا ہے تو تو اسے دوسرا بنا دے تو بھی تو کمہار ن ہے۔"

اُس نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں ورنہ زینتاں پتہ نہیں کیا کہہ دیتی۔ شام کو وہ گاؤں پہنچا تو اس کا خدشہ درست ثابت ہوا، سارے گاؤں میں باوے کے گم ہو جانے کی خبر پھیل چکی تھی۔

تنور، چوپال، مسجد اور بڑی دوکان پر ہر جگہ لوگ اس کی سادگی اور بیوقوفی پر ہنستے اور وہ جدھر سے گزرتا اُسے چھیڑتے۔

"سُنا ہے دِتّے ـــــ تیرا بندہ گم ہو گیا ہے؟"

"یار دِتّے ـــــ بڑا افسوس ہے تُو نے ساری عمر میں صرف ایک باوا بنایا تھا وہ بھی چیل اُٹھا کر لے گئی۔"

مولوی صاحب نے لاحول پڑھ کر کہا "جب شِرک کے کام کرو گے تو ایسا ہی ہو گا۔ کم بخت بُت بناتے ہو، یاد رکھو اللہ ایسے لوگوں کی مَت مار دیتا ہے۔"

اسے بے حد رنج ہوا ـــــ زینتاں کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اُسے زینتاں پر بہت غصّہ آیا مگر وہ ضبط کر گیا۔ اسے پہلے ہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ اس سے رُوٹھ نہ جائے اس کے پاس زینتاں کو اپنے پاس رکھنے کے لئے کچھ بھی تو نہیں تھا۔ پتہ نہیں کاغذ کی یہ ناؤ اب تک کیسے سلامت تھی۔ وہ ہر روز گھر آتا اور اسے گھر میں پا کر متعجب ہوتا تھا ـــــ اسے دوپہر کو اکثر شبہ رہتا تھا لیکن وہ خلافِ توقع ہر روز روٹی لے کر آ جاتی تھی۔ باوے والی بات پر اس نے گاؤں والوں کی پھبتیاں، طعنے اور باتیں سُنیں اور برداشت کیں اور بظاہر ایسا رویہ اختیار کر لیا جیسے وہ زینتاں اور گاؤں والوں سے خود مذاق کر رہا تھا مگر اندر ہی اندر اس کے دل میں گرہ سی پڑ گئی اور اسے عجیب طرح کی چنتا لگ گئی، آخر وہ کدھر گیا؟ کون لے گیا؟

زینتاں کو اس کی بات کا یقین آ گیا اور وہ جلد ہی بھول گئی۔ لوگ بھی بھول گئے مگر وہ پریشان اور اداس رہنے لگا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب اس کے اور زیناں کے سوا وہاں کوئی

نہیں آیا تھا تو وہ کدھر گیا۔ زیتاں اس سے پریشانی اور اُداسی کا سبب پوچھتی تو وہ اسے اِدھر اُدھر کی باتوں میں ٹال دیتا۔

وہ گھگھو گھوڑے بناتا اور آوی میں پکاتا رہا اور زیتاں سر پر کھاری رکھے آس پاس کے دیہاتوں میں گلی گلی گھومتی اور کھلونے بیچتی رہی ـــــ شریہنہ کی ٹہنیاں کٹ کٹ کر گاؤں کے گھروں کے مختلف دروازوں پر سجتی رہیں۔ بہت سا وقت گزر گیا مگر اس کی الجھن دُور نہ ہوئی۔

اس دوران اس نے شہر جا کر جوتشی سے بھی پوچھا ـــــ سائیں بہار شاہ کے میلے پر طوطے سے فال بھی نکلوائی اور پیر ہدایت اللہ سے تعویذ بھی لیا مگر اس کی الجھن دُور ہوئی نہ اس کے ذہن سے باوے کا خیال محو ہوا کئی بار اس نے سوچا کہ وہ پھر سے بنا لے ـــــ سامنے بیٹھ کر سکھائے اور پکائے لیکن یہ سوچ کر اسے ہول آنا تھا کہ اگر اس کے دیکھتے دیکھتے وہ غائب ہو گیا تو؟

اُس نے ہر لوڑ میں سے اچھے اچھے کھلونے نکال کر گھر کی پڑچھتی پر محفوظ کئے ہوئے تھے اگر باوا پڑچھتی پر پڑا پڑا غائب ہو گیا تو وہ سچ مچ پاگل ہو جائے گا اور زیتاں کو پتہ چلا تو وہ خوف اور دہشت کے مارے بیہوش ہو جائے گی اور گھر کے در و دیوار سے خوف کھانے لگے گی۔

موسم آتے جاتے رہے۔ رُتیں بدلتی رہیں۔ بہار کے موسم میں نئی کونپلیں پھوٹتی اور برسات کے دنوں میں بادل اُمنڈ اُمنڈ کر آتے رہے۔ پھر ایک موسم برسات میں آسمان سے اس قدر پانی برسا کہ جل تھل ایک ہو گیا۔ سیلاب کا پانی اُترا تو کلر زدہ زمین پر جا بجا گھاس اور طرح طرح کی بوٹیاں اُگ آئیں۔

ایک ایسی صبح کو جب منڈیروں پر کوّے کلول کر رہے تھے اور چڑیاں چہچہا رہی تھیں دِتّے کے گھر سے چلم کے لئے جلائے گئے اُپلوں کا دھواں اور زیتاں کی چیخیں ایک ساتھ بلند ہوئیں جو تھوڑی دیر بعد گھنگھرو جیسے قہقہوں میں تبدیل ہو گئیں ـــــ اور اُسے پتہ چلا کہ اس کے گھر کے آنگن میں ایک ننھا سا شریہنہ اُگ آیا ہے پتہ نہیں شریہنہ کے بیج کب اور کیسے گھر میں آئے تھے۔ کیا خبر بیجوں کی کوئی پھلی زیتاں کی کھاری یا چنگیر میں آ گئی ہو، کوئی بیج اس کے اپنے جوتوں کے ساتھ چپک کر وہاں پہنچ گیا ہو یا پھر ہوا کے جھونکے اُسے اڑا لائے ہوں۔

"شریفہ برکت والا درخت ہے۔" اس نے سوچا اور اس کی نسل گاؤں میں ختم نہیں ہوئی
بوڑھا شریفہ ابھی کھڑا تھا کہ دوسرا اُگ آیا۔"
گھر کی پڑچھتی پر رکھے ہوئے کھلونوں کی گرد صاف کی گئی اور گھر کے اندر سارے فرش پر گوبر کا
لیپ کیا گیا۔
زیتاں ٹھیک ہو گئی اور کام کاج کرنے لگی تو وہ بھی ایک صبح کام پر روانہ ہوا
زیتاں نے کہا "دوپہر کو گھر آجانا دیتے ـــــ وہاں رہنا ٹھیک نہیں۔"
"کیوں ٹھیک نہیں"
"تمہیں یاد ہے وہ باوا "
"باوا" ۔ وہ چونک پڑا۔
"ہاں وہی باوا ـــــ جس کے غم میں تم اتنا عرصہ اداس اور پریشان رہے۔"
"تو تم جانتی ہو ؟"
"ہاں۔"
"اور تمہیں یقین ہے میں نے بنایا تھا ؟"
"ہاں مجھے یقین ہے کہ پورے گاؤں میں ایک ہی ایسا آدمی ہے جو ان چیزوں سے بھی محبت کر سکتا
ہے جو اس نے نہ بنائی ہوں۔"
اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے زیتاں کی طرف دیکھا اور اوزار اٹھا کر باہر نکل گیا۔

اپنا گھر

میں گندی اور بدبو دار نالیوں میں چاروں طرف سے گھرا ہوا تالاب ——

بارش اور تازہ پانی کی بوندوں کو ترستا ہوا ——

ایک جیسی صبحیں ایک جیسی شامیں ——

وہی گھر وہی آنگن ۔ وہی شہر اور سڑکیں ——

وہی ہر طرف مداریوں کی طرح چتر چالاک آدمی اور آسمان میں تھگلی لگانے والی بارہ تالن عورتیں —— !

منافقت سے اٹی ہوئی صورتیں ——

خود غرضی کے جالے —— سازشوں کی مکڑیاں ۔ اور وہی ٹانگیں کھینچنے اور میرے اٹھنے بیٹھنے کی جگہوں پر مرغیوں کی طرح گندگی پھیلاتے احباب ! وہی ہر روز ایک ہی طرح سو کر اٹھنا اور وہی ستّر ستّر قدم پیچھے ہٹ کر ایک دوسری سے ٹکریں مارتی گھر کی دیواریں ۔

بھاگم بھاگ دفتر کے لئے تیار ہونا ——

وہی میز اور وہی ایک جیسا ناشتہ ——

وہی دفتر اور وہی مردار کے انتظار میں بیٹھے ہوئے گدھوں کی طرح افسرانِ بالا کی نظریں ۔

وہی فائلیں اور وہی ایک جیسے قے کئے ہوئے لفظوں سے ان کا پیٹ بھرنا ۔

باہر سے تھک کر گھر آنا اور گھر سے اکتا کر باہر نکل جانا

کوئی سا کام بھی کرتا ــــ لگتا صدیوں سے یہی کر رہا ہوں۔ دفتر میں ٹیلی فون سنتے وقت ہیلو کہتا تو معلوم ہوتا جب سے پیدا ہوا ہوں ہیلو ہیلو کر رہا ہوں۔ ڈپو سے آٹا لینے کے لئے قطار میں کھڑا ہوتا تو لگتا جب سے کھڑے ہونا سیکھا ہے آٹا لینے کے لئے قطار میں لگا ہوں اور کبھی باری نہیں آئے گی۔

منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے کسی دوست کے گھر جاتا تو وہاں بھی وہی سب کچھ پُرانا اور برتا ہوا معلوم ہوتا ــــ وہی میز اور کرسیاں اور وہی ان کی ہمیشہ سے دیکھی ہوئی ترتیب باتوں کے ایک جیسے موضوعات۔ وہی ہر گھر کی اپنی ایک مخصوص خوشبو یا بدبو ــــ ایک جیسی چائے اور چائے کے برتن وہی ایک طرح میزبان نے ہر بار مصنوعی خندہ پیشانی سے استقبال کرنا اور خیریت پوچھنا اور وہی ایک جیسے کھوکھلے اور بناوٹی قہقہے!

اکتاہٹ اور بیزاری کی بارش سے بچنے کے لئے میں نئی نئی مصروفیات اور مشاغل کی چھتریاں تلاش کرتا ــــ گہری خاموشی اور سناٹے میں پتہ بھی گرے تو آواز چونکا دیتی ہے۔ گھپ اندھیرے میں جگنو بھی دِیا معلوم ہوتا ہے۔ میں گھر میں کپڑے لٹکانے والی نئی کھونٹی لا کر ٹھوکتا یا بیوی نئے رومال میں لپیٹ کر روٹی لاتی تو کچھ دیر کے لئے گھر نیا نیا لگنے لگتا۔ ہم دونوں میاں بیوی کماتے اور چھوٹی بڑی چیزیں خرید خرید کر گھر کو باسی ہونے سے بچانے کی کوشش کرتے رہتے مگر ہر نئی چیز اگلی صبح کو پُرانی ہو جاتی۔ پھر ہم میزوں، کرسیوں، صوفوں اور پلنگوں کی ترتیب بدل کر کام چلاتے۔ آپس میں لڑ پڑتے۔ جن سے لڑائی ہوتی ان سے صلح کر لیتے اور جن سے گاڑھی چھن رہی ہوتی ان سے دشمنی مول لے لیتے لیکن بات نہ بنتی مزہ نہ آتا ــــ لگتا ــــ جیسے ہم ایک بڑے سارے کنویں میں قید ہیں اور باہر نکلنے کے لئے دن رات ہاتھ پاؤں مارتے اور لہولہان ہوتے رہتے ہیں۔

ایک روز میں نے ایک کتاب پڑھی اور جلدی سے بند کرتے ہوئے کہا

"پتہ چل گیا ہے"

اس نے پوچھا "کس بات کا"

"باسی ہو جانے کا"

"وہ کیسے ؟"

"وہ اس طرح کہ ہم نے اپنے لئے بہت سی دشواریاں اور مشکلات خود پیدا کی ہوئی ہیں۔ ہمیں، خود نمائشی، تکلفات اور تصنع کی زندگی ترک کر کے سادہ اور فطری زندگی گزارنی چاہیئے۔ آسائشوں اور سہولتوں نے ہم سے سچی زندگی کا ذائقہ چھین لیا ہے اور سادگی کی ابتدا ر آج ہی سے ہونی چاہیئے"

اس نے کہا "کیوں نہ ہم چھٹیاں لے کر کچھ دنوں کے لئے گاؤں چلے جائیں اور بے تکلفی، سادگی اور فطری زندگی گزارنے کی عادت ڈالیں اور کھوئے ہوئے سچے ذائقوں سے آشنائی حاصل کریں"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک ہے ــــــ مجھے بھی گاؤں گئے ہوئے کئی برس ہو گئے ہیں گاؤں والے جب بھی آتے ہیں شکایت کرتے ہیں کہ میں گاؤں کو بھول گیا ہوں ــــــ ممکن ہے آب و ہوا کی تبدیلی سے باسی اور بدبودار ہونے کا یہ احساس کم ہو جائے جو ہمیں ایک جیسے باہر سے چمکتے مگر اندر سے سیاہ لوگوں میں رہتے ہوئے دن رات گھیرے رکھتا ہے"

اس نے کہا "پروگرام بنایئے ـــــــ میں بھی ایک جیسے برتنوں میں آلو گوشت اور گوشت آلو پکا پکا کر اکتا گئی ہوں۔ کہیئے کب چلنا ہے ؟"

"تم تیاری شروع کر دو" میں نے جواب دیا۔

اور گاؤں جانے کی تیاری شروع ہوئی۔

اخراجات کا تخمینہ لگایا گیا۔ ہم نے اپنے اپنے دفتروں میں چھٹی کی درخواستیں دیں اور منظور کرائیں ریل کار کی سیٹیں بک کرائیں اور ایک دوست سے کہہ کر ایک قابل اعتماد قسم کا آدمی تلاش کیا جو ہماری غیر حاضری میں گھر کی چوکیداری کر سکے۔ اسے دو تین روز پہلے بلا کر سب کچھ سمجھا دیا گیا کہ پانی کا نل اور سوئی گیس کا چولہا کس طرح بند کرتے ہیں اسے تاکید کر دی کہ وہ رات کو زیادہ دیر تک بتی نہ جلائے

رکھے۔ دُودھ والے سے ایک پاؤ سے زیادہ دُودھ نہ لے۔ اخبار والے کو منع کر دیا ہے مگر وہ غلطی سے اخبار ڈال جائے تو اس کی دکان پر واپس کر آئے۔ مرغیوں کو دانہ ڈالتا رہے اور قصاب کی دکان سے چھیچھڑے لاکر بلّی اور کتے کو ڈالنا نہ بھولے، اسے ڈاک کے بارے میں بھی بتا دیا گیا کہ کہاں اور کیسے سنبھال کر رکھنی اور بیرنگ خطوط کس طرح واپس کرنے ہیں اور اگر کوئی مہمان آجائے تو اس کے مرتبے کا اندازہ کس طرح لگانا اور اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔ ٹیلیفون کس طرح سننا اور کیا جواب دینا ہے اور رانگ نمبر سے کس طرح نمٹنا ہے۔

چوکیدار شریف اور اچھا آدمی معلوم ہوتا تھا پھر بھی ہم نے پڑوسیوں کو فرداً فرداً تاکید کر دی کہ وہ ہمارے گھر اور چوکیدار کا خیال رکھیں اور اس کی نگرانی کرتے رہیں کہ وہ اپنی ڈیوٹی خوش اسلوبی سے انجام دے رہا ہے یا نہیں اور اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو ہمیں گاؤں کے پتہ پر تار دیں۔

اس کے بعد سامان بندھنے لگا۔ بچوں کے لئے خاص طور پر ایسے کپڑے سلوائے گئے تھے جو گاؤں کی گلیوں کی کیچڑ اور گرد و غبار میں بھی کام دے سکیں۔ اپنے لئے ہم نے ریشمی اور قیمتی کپڑوں کے علاوہ سیدھے سادھے اور رات کو پہننے والے کپڑے بھی ساتھ رکھ لئے۔ تولئے۔ بنیانیں، انڈر ویئر، جرابیں، مفلر، کمبل، ٹائیاں، ازاربند، سوٹ، کوٹ اور پتلونیں۔ اس کے علاوہ سوئیٹریں، کوٹیاں، پاجامے، شلواریں، کُرتے اور ہر قسم کے جُوتے اور چپلیں، پتہ نہیں کس چیز کی کب ضرورت پڑ جائے اور پھر آخر گاؤں میں ہمیں والدین کے گھر میں تو بند نہیں رہنا تھا اور پھر گاؤں والے کیا سوچتے کہ ان کے پاس بس یہی دو چار جوڑے کپڑوں کے ہیں جنہیں بدل بدل کر پہنتے رہتے ہیں۔

اس خیال سے کہ گاؤں میں اچھی قسم کی چائے کی پتّی نہیں ملے گی۔ ہم نے چائے کے دو ایک ڈبے بھی ساتھ رکھ لئے اور اس خیال سے کہ خالص دُودھ کی چائے شاید بچوں کو ہضم نہ ہو یا ہمیں اس دُودھ سے مہک آئے خشک ولایتی دُودھ کا ایک ڈبہ بھی رکھ لیا۔ پپّو کے لئے دو چار نئے فالتو رکھ لئے اور ضد کرنے کی صورت میں اسے منانے کے لئے ٹافیاں، بسکٹ اور چیونگم بھی۔ بلکہ چند ایک غبارے بھی رکھ لئے۔ وہ جب بھی ضد کرتا تھا غبارہ لے کر بلکہ پھاڑ کر چُپ ہوتا

تھا تاہم نے غباروں میں ہوا نہیں بھرائی کیونکہ ہم تبدیلی آب و ہوا کے لئے ہی تو جا رہے تھے اور گاؤں میں ہوا شہر کی نسبت زیادہ صاف اور خاصی مقدار میں دستیاب تھی!

گاؤں کی چھوٹی سی دکان پر چیزیں اچھی نہیں ملتیں اور پھر مہنگی بھی ہوتی ہیں اس لئے کپڑے دھونے کا پاوڈر، نہانے کا صابن، شیمپو۔ ہیئر ٹانک اور ہیئر کریم، ٹوتھ پیسٹ اور منجن، شیونگ اور میک اپ کا سامان بھی ہم نے ساتھ رکھ لیا۔ ریڈیو ٹرانسسٹر اور ٹیپ ریکارڈر تو بہر حال ضروری چیزیں تھیں۔ گاؤں میں گزارے ہوئے لمحوں کو محفوظ کرنے کے لئے کیمرے میں نئی فلم بھی ڈلوالی۔ بڑے لڑکے کو عرصہ سے بندوق کا دھماکہ سننے کی خواہش تھی اس لئے کچھ کارتوس اور بندوق بھی ساتھ رکھ لی کیا پتہ کچھ شکار وغیرہ بھی مل جائے۔ گاؤں میں جوتے جلد خراب اور میلے ہو جاتے ہیں اس لئے مختلف رنگوں کی پالش اور برش بھی ضروری تھے لکھنے پڑھنے کا سامان رائٹنگ پیڈ، دو چار خوبصورت بال پوائنٹ، سادہ اور ڈاک کے لفافے اور ٹکٹیں۔ گاؤں میں بیٹھ کر دوستوں اور جاننے والوں کو خط لکھیں گے اور گاؤں کی سادہ اور فطری زندگی کی تصویر کشی کریں گے۔

پڑھے لکھے آدمی کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ لکھتا یا پڑھتا ہوا دکھائی دے۔ اب گاؤں میں اخبار ملنے کا تو کوئی امکان ہی نہیں تھا چنانچہ ہم نے چند ایک رسالے، شاعری اور افسانوں کے مجموعے، انگریزی کے چند ایک ناول جنہیں خرید کر محض سجاوٹ اور بھرم قائم رکھنے کے لئے بک شیلف میں رکھا ہوا تھا ساتھ لے لئے ــــ کہ فراغت ہو گی اور مطالعہ کریں گے۔ ساتھ ہی لوگوں کو حیران کریں گے کہ یہ اتنی موٹی موٹی کتابوں کے اتنے باریک باریک الفاظ کیسے پڑھ لیتے ہیں۔ بیوی کو کبھی کبھی پتے کا درد ہو جاتا تھا اس لئے حفظِ ما تقدّم کے طور پر فوری اثر کرنے والی گولیوں کی شیشی، ننھے کا گلا خراب ہو جانے کے امکان کے پیشِ نظر اس کا سیرپ اور ہنگامی ضرورت کی دوسری دوائیں اور تھرمامیٹر ــــ گاؤں میں اچھی برانڈ کے سگریٹ کہاں، چنانچہ دو چار کارٹن سگریٹوں کے ــــ خوشنما گیس لائیٹر اور لائیٹر کی گیس کی شیشی۔

بچے ناشتہ میں ڈبل روٹی کے عادی تھے چنانچہ رس اور ڈبل روٹیوں کا انتظام بھی کر لیا گیا

کسٹرڈ پاؤڈر، سیویاں اور خشک میوے ہم ویسے ہی گاؤں والوں کے لئے تحفے کے طور پر لے جا رہے تھے اور گھر میں ڈپو سے منگا کر جو چینی رکھی ہوئی تھی وہ بھی ساتھ رکھ لی بلکہ بیوی نے بہت سی آؤٹ آف فیشن ہو جانے والی کراکری بھی ایک بڑے سارے ڈبے میں بند کر لی اس کا ارادہ تھا وہ واپسی پر یہ کراکری وہیں چھوڑ آئے گی اور ڈبے میں چاول بھر لائے گی۔

جس روز ہمیں جانا تھا اس رات کو بارش ہو گئی۔

ریل سے اتر کر گاؤں جانے کے لئے بس کا سفر کرنا پڑتا تھا اور ایسے موسم میں پھسلن کی وجہ سے بس کے حادثے کا ڈر تھا۔ ہم نے ریل کار کے ٹکٹ واپس کئے اور ریلوے کے ایک بڑے افسر سے سفارش کرا کے دو روز بعد کی سیٹیں بک کرائیں ــــ مگر اسی شام کو اچانک والد صاحب آ گئے۔

انہیں معمولی اور میلے کچیلے کپڑوں میں دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ ہل چلاتے یا چارہ کاٹتے ہوئے اچانک کوئی بُری خبر سن کر اٹھ کھڑے ہوں اور کپڑے تبدیل کئے بغیر آ گئے ہوں۔ ان کے پاس کوئی سامان نہیں تھا ہم پریشان ہو گئے خدا خیر کرے سلام دُعا کے بعد پوچھا تو کہنے لگے

"آج صبح نلائی کرتے ہوئے اچانک تم لوگوں اور بچوں کو دیکھنے کے لئے دل تڑپا ــــــ میں نے گھر جا کر تمہاری والدہ کو اطلاع دی ۔ کرایہ لیا اور چلا آیا ــــــ سوچا اپنے ہی گھر تو جا رہا ہوں۔"

باگھ بگھیلی رات

مولوی صاحب پڑھے لکھے اور عقلمند آدمی تھے۔ نہایت ہوشیاری سے اس مشکل سے نکل گئے۔ انہوں نے کہا "میں نے حلال ضرور کی تھی مگر مجھے نہیں معلوم کس کی تھی۔ سجاول موچی مجھے بُلا کر لے گیا تھا۔ اسی نے کھال بھی اُتاری تھی اسے ہی پتہ ہوگا"۔

حکم ہوا "سجاول موچی کو حاضر کیا جائے"۔

سجاول موچی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ان کمی کمینوں کے پاؤں تلے زمین ہی کتنی ہوتی ہے۔

اُدھر والوں نے دھمکی دی "ٹھیک ٹھیک بات کرنا ورنہ پلٹ کر گاؤں کا رُخ نہ کرنا"۔

اِدھر والوں نے پیغام بھیج دینا کافی سمجھا "زیادہ بقراط سقراط بننے کی کوشش نہ کرنا ورنہ نتیجے کے تم خود ذمہ دار ہوگے"۔

سجاول کی سمجھ میں نہ آیا کیا کرے کیا نہ کرے۔ اس نے جرمانے کے طور پر اپنی گرہ سے پوری رقم ادا کر دینا چاہی مگر استغاثہ نے کہا "ہمیں پیسوں کی ضرورت نہیں۔ یہ شرک کا معاملہ ہے۔ ہم انہیں اندر کروا کر دم لیں گے"۔ اسے بار بار ایک ہی راستہ سجھائی دیتا۔ گھر کا سامان اور گھر والوں کو ساتھ لے کر راتوں رات کہیں خود ہی ہجرت کر جائے مگر اس طرح اس کے مفرور قرار دیئے جانے کا ڈر تھا۔ میں نے اس کی ہمت بندھائی "کتاب میں لکھا ہے۔ سانچ کو آنچ نہیں"۔

اس نے کہا "تمہارا علم میرے کام نہیں آ سکتا کاکا ۔ وہ کتابی باتوں پر عمل نہیں کرنے دیں گے ۔ انہوں نے کتابیں پڑھی ہیں "۔

وہ بولی "ابا ۔ اگر تم نے جھوٹی گواہی دی تو تم خدا کو اور میں اپنی سہیلیوں کو کیا منہ دکھاؤں گی"۔

کہنے لگا "تو نہیں جانتی بیٹی خدا تو پھر معاف کر دیتا ہے مگر یہ ظالم لوگ کبھی معاف نہیں کریں گے۔ مجھ صاف سیدھا سچ نہ بلواؤ درمیان کا کوئی تیسرا راستہ بتاؤ"۔

ہم تینوں سر جوڑ کر بیٹھے مگر ہمیں درمیان کا کوئی تیسرا راستہ سجھائی نہ دیا ۔ اسی بحث و تکرار اور کشش و پنج میں بہت سے دن گزر گئے اور تاریخ کا دن آگیا ۔

وہ متذبذب سا کسی تیسرے راستے کے بارے میں سوچتا ہوا چلا گیا ۔ مگر جب وہ بیان دینے لگا تو اس کے منہ سے وہی کچھ نکلا جو اس نے دیکھا سنا تھا ۔

وہ خود بھی حیران تھا کہ کب اور کیسے اس نے سچ کے زہر کا پیالہ منہ سے لگالیا ۔ باہر آکر اس نے ان سے معافی مانگنا چاہی مگر انہوں نے بھیڑیوں جیسے منہ پھاڑ کر کہا "تمہارے اپنے گھر میں بھی بھیڑ ہے۔ اب دیکھتے ہیں تم اسے کیسے بچاتے ہو ۔

وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا اس نے سوچا تھا بہت ہوا تو سیپ بند کر دیں گے یا زیادہ سے زیادہ گاؤں سے نکال دیں گے مگر اس نے یہ کچھ نہیں سوچا تھا ۔ یوں یہ کوئی ایسی انہونی یا بعید از قیاس بات بھی نہیں تھی ۔ وہ اپنے برابر کے شریکوں کی بھیڑ دن دیہاڑے ذبح کر کے ہڑپ کر سکتے تھے ۔ وہ تو ایک غریب کمی تھا جس کا کوئی جوان بیٹا نہ بھائی ۔ اس کی سمجھ میں ایک ہی بات آئی کہ کسی طرح بھاگم بھاگ ان سے پہلے گاؤں پہنچ جائے ۔

اگلے روز گاؤں میں صبح تو ہوئی مگر ہر طرف گہری خاموشی تھی ۔ لگتا تھا چڑیاں آج گھونسلوں سے باہر نہیں آئیں ۔ فاختائیں گھگھو گھوہ الاپنا، بطخیں جوہڑوں میں تیرنا اور کوّے منڈیروں پر بیٹھ کر بچھڑے ہوؤں کے سندیسے دینا بھول گئے ہیں ۔ گلیوں میں اداسی کی دھول اڑنے لگی، درخت سرگوشیاں کرتے، آہیں بھرتے اور گلیوں کے آر پار کی کچی پکی دیواریں ایک دوسری کے گلے لگ کر بین کرنا چاہتیں ۔

ہنس کر بات کرنا اس کی عادت تھی اور اس نے جس کسی سے بھی بات کی تھی وہ سر میں خاک ڈالے گریبان پھاڑے گلیوں میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا۔ تنوروں نے اس روز ادھ جلی روٹیوں کو جنم دیا ۔ پنگھٹ کے کنوئیں کی چرخی سے رونے کی سی آواز نکلی اور بوکا اتنا وزنی ہو گیا کہ نکالنا مشکل ہو گیا تھا۔ پوری بستی اس کے بدن کی روشنی سے محروم ہو کر ویران اور تاریک ہو گئی ہے۔

اس کے گھر والوں کا کہنا تھا کہ ننھیال سے اس کا ماموں آیا اور راتوں رات اُسے ساتھ لے گیا کیونکہ ممانی سخت بیمار تھی مگر کسی کو اس بات پر یقین نہ آیا۔ سب جانتے تھے کہ وہ اپنے ماموں زاد سے بیاہ کرنے سے انکار کر چکی تھی اور اس کے ننھیال والے ایک عرصہ سے خفا تھے مگر کسی کو اس بات کی بھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ گئی کس کے ساتھ تھی۔ وہ جس جس کے ساتھ بھاگ سکتی تھی، وہ سب تو ٹھنڈی آہیں بھرتے گلیوں کی خاک چھانتے پھرتے تھے۔ اس کی ہجولیوں میں سے صرف شیدو مہترانی کو جو گھروں میں صفائی کا کام کرنے جاتی تھی معلوم تھا کہ اس کی جُون بدل گئی تھی اور کھیتوں کھلیانوں میں ہرنی کی طرح قلانچیں بھرنے، پیڑوں پر پینگیں جھوٹنے اور تتلی کی طرح ہوا کے دوش پر اڑتی پھرنے والی لڑکی راتوں رات ایک مریل سی بھیڑ میں تبدیل ہو گئی تھی اور خونخوار بھیڑیوں کے خوف سے ایک بڑی حویلی کے چھوٹے سے تاریک کونے میں دبکی ہوئی تھی۔

میں جگہ جگہ گھومتا اور اس کے لئے افواہیں اور خبریں جمع کرتا اس کی خاطر قتل کرنے اور پھانسی پر چڑھ جانے والوں کی ڈینگیں سنتا۔ گاؤں کے لوگوں کی باتیں اور گبھروؤں کی شکلیں دیکھ کر مجھے ہنسی آتی اور یہ سوچ کر میرا سینہ فخر سے تن جاتا کہ جس روشنی کے اوجھل ہونے کی وجہ سے سارا گاؤں تاریکی میں ڈوب گیا تھا وہ دن رات ہمارے گھر کے پسار اور کوٹھڑی میں جگمگاتی اور نور برساتی تھی۔ خوشی کے مارے میرے اندر میرا ہم عمر کان پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز میں ڈھولے گاتا۔

"چھتی ہمبی اے ٹاہلی ۔ ہیٹھ اے بھیڈاں دا واڑا

بھیڈاں نیں ڈب کھڑبیاں ...."

مگر پھر یہ سوچ کر کہ خونخوار بھیڑئیے اس کی بُو سونگھتے ہوئے اس تک پہنچ گئے تو کیا ہوگا۔ میں

پریشان ہوجاتا اور اندر ہی اندر غصے کی سل پر انتقام کی چھریاں رگڑنے لگتا۔ ایک ساتھ بہت سے گھوڑوں پر سوار ہو کر باگھ بگھیوں کے گرد گھیرا ڈال لیتا۔

وہ مجھ سے گلیوں، چوپالوں اور بیٹھکوں پر ہونے والی باتیں سُنتی۔ بادشاہوں اور خوبصورت رانیوں کی کہانیاں سنتی سناتی اور بھیڑیوں کے تیز دانتوں اور نوکیلے پنجوں کے خوف کو ایک طرف رکھ کر ہنسی مذاق کی باتیں کرتی اس کے ہنسنے کا منظر عجیب ہوتا۔ میری آنکھیں چندھیا سی جاتیں میرے اندر سے دُگنی عمر کا مرد نکل کر اس کے قدموں میں بیٹھ جاتا اور کہتا۔

"اذن دو۔ میں ساری دنیا کے بھیڑیوں کے پیٹ پھاڑ دوں۔"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیتی اور مدھم سُریلی آواز میں عبدالستار کی یوسف زلیخا گنگنانے لگتی۔

"ہے میں ایسے مار مکائیاں دیسوں دُور کرائیاں"

پھر ایک ایک کر کے میری سکول کی کتابیں اور گھر میں موجود پنجابی سی حرفیاں اور بارہ ماہے ختم ہو گئے مگر چاروں طرف پھیلی ہوئی خوف کی سیاہ رات ختم نہ ہوئی۔

وہ سارا دن اندر چھپی رہتی رات کے وقت تھوڑی دیر کے لئے باہر آتی اس نے چھلے اور چنگیریں بنا بنا کر گھر کی ساری پڑچھتیاں بھر دیں۔ بستر کی چادروں تکیوں کے غلافوں پر پھول کاڑھ کاڑھ کر اس نے پورے گھر کو گلزار بنا دیا۔ اس کے گھر والے چوروں کی طرح چھپ کر رات کی تاریکی میں اسے ملنے آتے اور تسلی دے جاتے۔ وہ مجھ سے کہتی

"اگر تم نہ ہوتے تو میں گھٹ کر مر جاتی۔ تم سے باتیں کر کے میرا دل بہل جاتا ہے۔"

وہ اپنے ابا کے سچ بولنے پر خوشی کا اظہار کرتی اور فخر سے کہتی "ابا نے میرا مان رکھ لیا ہے۔ اندھیرا تو چھٹ جائے گا مگر کالک کبھی نہ اُترتی۔"

وہ مجھے یقین دلاتی کہ وہ اداس اور پریشان نہیں ہے مگر میں اسے قید جیسی زندگی گزارتے ہوئے دیکھ کر اداس ہو جاتا۔ دل ہی دل میں غصے سے کھولتا اور طرح طرح کے خطرناک منصوبے بناتا رہتا۔

پھر اس نے مجھ سے خط لکھوانا شروع کر دیئے۔

وہ بولتی جاتی اور میں لکھتا جاتا۔ گرمیوں کی تپکر دوپہروں میں اور بعض اوقات رات کو لالٹین کی روشنی میں ہم پہروں اکٹھے بیٹھ کر اس کے نام چٹھیاں لکھتے۔ یہ بڑی انوکھی، دلچسپ اور خوبصورت باتیں ہوتیں جو میں نے کہیں پڑھی سُنی نہیں تھیں۔ اس کی بے وفائیوں، بے خبریوں اور سنگدلیوں کی شکائتیں اور اور شکوے ہوتے اس کے فراق میں اُپلوں کی طرح سُلگنے، پانی کے بغیر مچھلی کی طرح تڑپنے اور صابن کی گاچی کی طرح گھُرنے کا ذکر ہوتا۔ وہ اسے بار بار تاکید کرتی کہ وہ جلد از جلد آئے اور اسے بھیڑیوں کے خوف اور قید کی سی زندگی سے رہائی دلائے۔ لکھ لکھ کر میرے ہاتھ تھک جاتے مگر اس کی باتیں ختم نہ ہوتیں۔ میں جب تک لکھتا رہتا وہ سامنے بیٹھ کر پنکھا جھلتی رہتی۔ پھر خط کو تہ کر کے اپنے پاس رکھ لیتی اور اگلے روز شیدو کے آنے اور خط لے جانے کا انتظار کرنے لگتی۔

کبھی کبھی مجھے اس پر جسے میں نے اس وقت تک دیکھا ہوا نہیں تھا غصّہ آتا۔ آخر وہ اس کے کسی خط کا جواب کیوں نہیں بھیجتا تھا مگر پھر سوچتا کیا پتہ جواب آتا ہو، مگر وہ مجھے بتاتی نہ ہو اسے پڑھنا تو آتا ہی تھا اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ مجھ سے اس کا نام اور پتہ اور اس کے بارے میں بہت سی دوسری باتیں چھپاتی تھی۔ شاید اسے ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا یا شاید اسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آتا۔

اس کے گھر والوں کا ہمیشہ سے اصرار تھا کہ گھر کی بات ہے۔ قرض لئے بغیر فرض ادا ہو جائے گا اُسے اس کے ننھیال میں بیاہا جائے مگر اُسے اپنے ماموں زاد سے چڑ تھی۔ کہا کرتی۔ "ہے تو وہ میرے ماموں کا بیٹا مگر خدا معاف کرے شکل سے بالکل بھیڈ کُٹ لگتا ہے۔"

میرے گھر والوں نے اس کے ابا کی پھٹی پرانی پگڑی پاؤں سے اٹھا کر اسے لوٹاتے ہوئے تسلی دی تھی مگر ساتھ ہی ہدایت بھی کی تھی کہ وہ جلد از جلد کوئی مستقل انتظام کرے۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس کے والدین کا اصرار کہ وہ ننھیال میں شادی کرنے پر رضامند ہو جائے، بڑھتا جا رہا تھا مگر وہ اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

پھر ایک دن میری چھٹیوں کا حساب کر کے وہ نہایت پریشان ہوئی۔ کہنے لگی

"تم چلے جاؤ گے تو میں ایک دن بھی اس کال کوٹھڑی میں زندہ نہیں رہ سکوں گی۔"

مجھ سے اکثر اپنی سہیلیوں، ان کی مصروفیتوں اور کپڑوں گہنوں کے بارے میں پوچھتی۔ سیندو آتی تو اس سے دیر تک سرگوشیاں کرتی۔ گاؤں کے تالابوں۔ ٹیلوں، فصلوں، کھیتوں اور دھوپ میں چرتے ہوئے مویشیوں کے بارے میں پوچھتی۔ بیٹھی بیٹھی مجھ سے اچانک پوچھ لیتی۔

"جلاہوں کے گھر کے سامنے والی گلباسی پر پھول لگتے ہیں؟

مسجد کی منڈیر پر کبوتر بیٹھتے ہیں؟

پنگھٹ کے کنوئیں کی چرخی سے گیڑتے ہوئے رؤں رؤں کی آواز سنائی دیتی ہے"؟

کبھی کبھی مجھے وہ چٹھیاں زبانی سناتی جو اس نے مجھ سے لکھوا کر وقتاً فوقتاً سیندو مہترانی کے ہاتھ اسے بھجوائی ہوتیں۔ میں حیران ہوتا اس کی یادداشت اور حافظے کی داد دیتا۔ وہ چٹھی کا مضمون سناتی اور مجھے یاد آتا میں نے بالکل یہی کچھ لکھا تھا مگر لکھتے وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اُسے وہ سب باتیں ازبر ہو جاتی ہوں گی۔

پھر ایک رات اس کی ماں ملنے آئی تو دونوں ماں بیٹی دیر تک باتیں کرتی رہیں اور اگلے روز مجھے یہ جان کر بے حد حیرت ہوئی کہ وہ اپنے ماموں زاد سے شادی کرنے پر رضامند ہو گئی تھی۔ میں نے پوچھا تو رو پڑی۔ کہنے لگی، "کیا کرتی؟"

"اور وہ"، میں نے پوچھا "جسے ہم نے اتنے خط لکھے"۔

کہنے لگی "اس کا ذکر اور انتظار اب فضول ہے۔ وعدہ کرو تم بھی اب اس کا ذکر کبھی نہیں کرو گے"۔

میں نے وعدہ کر لیا مگر میں حیران تھا اور پریشان بھی۔ اب کسی روز چپکے سے اس کا ماموں زاد جو اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ آئے گا اور اسے لے جائے گا۔

شہنائی بجے گی نہ ڈھولک۔ اُسے مہندی لگائی جائے گی نہ اس کی سہیلیاں گیت گائیں گی اور سب سے بڑھ کر وہ صدمہ جو ایک نہ ایک دن پورے گاؤں کو مل کر سہنا تھا اب مجھے اکیلے برداشت کرنا ہوگا۔

اور پھر ایک رات

جب چاند ڈوب چکا تھا۔ ہوا بند تھی اور باکھوں سے ریوڑوں کی رکھوالی کرنے والوں کی گنگنائی ہوئی آوازیں آ رہی تھیں، گلی میں آہٹ ہوئی اور پانچ چھ مسلح گھوڑ سوار گھر کے دروازے کے سامنے آ کر رُکے۔ پچھلے کئی دنوں سے مختلف اطراف سے ڈاکے پڑنے کی خبریں آ رہی تھیں۔ ہمارے اوسان خطا ہو گئے مگر آپا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ پتہ چلا کہ بارات تھی۔

پورے چالیس روز بعد خوفناک، طویل اور بھاگ بھگیلی رات ختم ہوئی تھی یا شاید شروع ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر میں اس کے ماں باپ، نمبردار اور مولوی صاحب بھی آ گئے۔ مجھے چھت پر نگرانی کے لئے بھیج دیا گیا۔

جب نکاح ہو رہا تھا، اچانک میراجی چاہا سب سے اونچی منڈیر پر کھڑے ہو کر ہوکا دوں، "گاؤں والو۔ جاگو۔ گاؤں لُٹ گیا۔"

رُخصت ہونے سے پہلے اُس نے مجھے اندر بلوایا۔

گلے لگا کر دیر تک روتی رہی۔ پھر جاتے ہوئے سسکی رُک کر آہستہ سے بولی

"تمہارے کپڑوں کے ٹرنک میں ایک پوٹلی رکھی ہے اسے سنبھال کر رکھنا۔"

دوسرے روز صبح ہوئی

چڑیاں چہچہائیں

کوّے بچھڑے ہوؤں کے سندیسے لے کر منڈیروں پر آ بیٹھے۔

جلاہوں کے گھر کے سامنے والی گلباسی پر پھول کھلے

پنگھٹ کے کنوئیں کی چرخی سے کُرلانے کی آواز سی گونجی

اور سیڑھیوں کے درمیان بیٹھ کر اپنے نام اپنے ہاتھ کے لکھے خطوط پڑھتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

ماس اور مٹی

سب سے پہلے حمد اُس رب کی جس کی قدرتوں کا کچھ شمار نہیں۔

اس نے لاکھوں کروڑوں دُنیائیں، کہکشائیں اور چاند سورج پیدا کیے۔

اس نے دس لاکھ میل قطر کا سورج بنایا اور اسے کائنات میں ایک نقطے کی حیثیت بخشی۔ اس نے اربوں کھربوں ایسے ستارے بنائے جن میں سے بعض کی روشنی ہم تک لاکھوں کروڑوں سالوں میں پہنچتی ہے۔

پھر درود اُس نبیؐ پر جس نے بادشاہوں کو فقیری اور فقیروں کو بادشاہت دے کر ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا اور اس نے ان کی عقلوں سے پتھر ہٹا کر اپنے پیٹ پر باندھ لیے۔

پھر سلام روشنی کے ان میناروں کو جنہوں نے باطل کا ساتھ نہ دیا اور حق کی خاطر اپنی گردنیں کٹوائیں اور کھالیں اتروائیں۔

پھر رحمت ان عظیم لوگوں پر جنہوں نے فضا میں ایتھر، زمین میں تیل اور ایٹم میں الیکٹرون پروٹون دریافت کیے۔

اور آخر میں شاباش ان بہادروں کو جنہوں نے ہر حال میں زندگی کا سفر جاری رکھا اور اس رب کا جس کا ذکر اُوپر آیا ہے لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

حمد، نعت اور اس تمہید کے بعد اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

یہ کہانی بس کے اپنے گرد گھومتی ہے لیکن اس کا مرکزی کردار ناتوسانسی ہے۔

ناتوسانسی میرے گاؤں کا رہنے والا ہے اور کچھ عرصہ سے گاؤں چھوڑ کر شہر میں آگیا ہے۔ آپ نے اخبارات میں اکثر پڑھا ہوگا کہ کچھ عرصے سے شہر میں چوری کی انوکھی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ چوروں کی ایک ٹولی بڑے بڑے بنگلوں میں گھس کر یا نقب لگا کر باورچی خانوں سے کھانے پینے کی ہر چیز چٹ کر جاتی ہے۔ ان بھوکے پیاسے چوروں کے ہاتھ جو چیز لگتی ہے وہ کھا پی کر غائب ہو جاتے ہیں کپڑے، زیور، نقدی اور دوسری قیمتی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ وہ شربت، بیئر اور اسکوائش کی بوتلیں پی جاتے ہیں۔ ریفریجریٹروں میں رکھی آئس کریم، پھل، مکھن اور ڈبل روٹیاں کھا جاتے ہیں اور جتنی بھی شکر ملے پھانک جاتے ہیں۔

رب نے ہر انسان کی روزی مقرر کی ہوئی ہے۔

وہ پتھر میں کیڑے کو بھی پالتا ہے۔

اس نے ہر آدمی کا حصہ زمین کے اندر کہیں نہ کہیں چھپا کر رکھ دیا ہوا ہے تاکہ وہ دنیا میں آئے تو اپنا حصہ تلاش کر لے۔

کچھ لوگ اپنا حصہ تلاش نہیں کرتے اور بھوک سے مر جاتے ہیں یا مانگ تانگ کر اور چھین جھپٹ کر وقت گزارتے ہیں۔

بعض دوسروں کے حصے بھی تلاش کر لیتے ہیں پھر مانگنے والوں کو تھوڑا تھوڑا دے کر دعائیں لیتے اور ثواب کماتے ہیں۔

چوروں کی یہ ٹولی بھی اپنا حصہ تلاش کرتی پھرتی ہے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس ٹولی میں کم از کم چھ سات چٹورے آدمی ضرور ہیں جو دس بارہ آدمیوں کی خوراک ایک ہی وقت میں ہضم کر جاتے ہیں۔ ٹڈی دل کی طرح جہاں سے گزر جاتے ہیں ہر چیز کا صفایا کر دیتے ہیں۔

مجھے شبہ ہے ناتو سانسی ان میں ضرور شامل ہے۔

میں نے اسے کئی مرتبہ بس اسٹاپوں، پھل فروٹ کی دکانوں اور سینماؤں کے ٹی اسٹالوں پر دیکھا ہے اس نے بھی مجھے دیکھا ہے لیکن شاید میرے لباس کی وجہ سے وہ مجھے پہچان نہیں سکا یا پھر جان بوجھ کر اجنبی بنا رہا ہے کہ سلام نہ کرنا پڑے۔ مجھے یاد ہے اس نے زندگی بھر گاؤں کے کسی زمیندار یا چودھری کو سلام نہیں کیا شاید یہی وجہ تھی کہ ہر ایک کو اس پر خواہ مخواہ غصہ آجاتا تھا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگوں کو اس پر محض اسی وجہ سے غصہ آتا تھا۔ شہر آنے سے پہلے اس نے گاؤں والوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اباجی کو ڈر تھا کہ وہ شہر آ کر مجھے ڈھونڈھ لے گا اور پھر روزگار یا بھیک کے سلسلے میں ہر وقت مجھے پریشان کرتا رہے گا۔ لیکن اس نے تو مجھے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا ہے اور اسے اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ اُسے گلے سڑے پھل جمع کرتے اور سگریٹ کے ٹکڑے چنتے دیکھا ہے۔ سینماؤں میں انٹرول کے وقت وہ ٹی اسٹالوں پر کھڑا نظر آتا ہے اور کوکا کولا اور سیون اَپ کی بوتلوں میں بچے کھچے گھونٹ پیتا ہے جنہیں لوگ اس لئے چھوڑ جاتے ہیں کہ ان کے پیٹ میں جگہ نہیں ہوتی کئی بار میرا جی چاہا اسے اپنے پاس بلاؤں اور کچھ دے ڈالوں مگر اس کی بے نیازی دیکھ کر ارادہ ترک کرنا پڑا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے فلٹر ٹیپڈ سگریٹوں کا دھواں اڑاتا اور باری باری ہر بوتل سے بچا کھچا سوڈا واٹر پیتا رہتا ہے۔ اس نے کبھی میری پرواہ نہیں کی۔ اُسے شاید کسی کی بھی پرواہ نہیں۔ اپنے باپ کی بھی نہیں جسے اس کے بدلے گاؤں والوں نے مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا اور اس کی چمڑی ادھیڑ دی تھی۔ اس کا باپ عرصہ سے اپنی ادھڑی ہوئی کھال، کٹے ہوئے جسم اور ٹوٹی ہوئی ہڈیوں سمیت چارپائی پر پڑا کراہتا رہتا ہے۔ مگر نا تو نے پلٹ کر کبھی اس کی خبر نہیں لی۔

ہم دونوں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں لیکن ہم ایک دوسرے سے متعارف نہیں ہوئے۔ ہمارے درمیان دن بدن فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے لیکن مجھے بھی اس کی پرواہ نہیں آخر نا تو میرے کس کام آسکتا ہے؟

میں نے گاؤں میں بھی شاید ہی کبھی اس سے بات کی ہو۔ میرا اس سے کبھی تعلق نہیں رہا۔ ہاں اس کی ماں عالمے اور بہن ماد و ہر روز بھیک مانگنے گاؤں کا چکر لگاتی ہوئی ہمارے ہاں بھی آتیں اور

دعائیں دیتیں۔ مجھے دیکھ کر اکثر وہ تھوڑی بھیک پر قناعت نہ کرتیں اور اماں کو معمول سے کچھ زیادہ دینا پڑتا۔

شیرو اس کا باپ تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹے کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ کام نہ کرنا ان کی خاندانی روایت تھی۔ وہ چوری کر سکتے تھے، ڈاکہ ڈال سکتے تھے، قتل کر سکتے تھے، شکار کھیل سکتے تھے مگر کام کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ علمے اور مادو کی جمع کی ہوئی بھیک مزے لے لے کر اڑا سکتے تھے مگر خود بھیک نہیں مانگتے تھے۔ مانگ ہی نہیں سکتے تھے۔

وہ حرام حلال کے چکر میں نہیں پڑتے تھے۔ کچھوے۔ بلیاں۔ گیدڑ۔ نیولے اور لومڑیاں سب کچھ کھا جاتے تھے۔ مرے ہوئے مویشیوں کا ماس، کتوں، کووں اور گدھوں سے چھین کر ہڑپ کر جاتے تھے، ماس کھانا انہیں بے حد اچھا لگتا تھا خواہ وہ مرے ہوئے مویشیوں کا ہو یا مارے ہوئے مویشیوں کا ———— ہم آپ مُردار جانور یا مویشی کا ماس نہیں کھاتے۔ کھانے کے لئے اسے خود مار لیتے ہیں۔ ہم زندہ مویشیوں کی بوٹیاں نہیں اتارتے، زندہ انسانوں کی بوٹیاں اتار لیتے ہیں۔ لیکن وہ الگ مسئلہ ہے۔

شیرو بڑا بھلا مانس اور قناعت پسند تھا اس نے آج تک ریل گاڑی نہیں دیکھی تھی۔ وہ کبھی شہر نہیں گیا تھا۔ وہ شکار اور مُردار پر گزارہ کر لیتا تھا یا پھر علمے اور مادو کی لائی ہوئی بھیک سے پیٹ بھر لیتا تھا۔ اکثر دارو پی کر اور حقے پر کیکر کی چھال کے انگارے رکھ کر وہ دیوار سے لگا بیٹھا رہتا اور گدھوں کی پرواز کا جائزہ لیتا رہتا۔ مگر ناتو نے گاؤں والوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی وہ گھروں اور کھیتوں، کھلیانوں میں ہر جگہ ہاتھ صاف کرنے لگا تھا۔ وہ ڈربوں سے مرغیاں ہی نہیں، باڑوں سے بھیڑ بکریاں بھی اٹھا کر لے جاتا تھا اور ان کو مار کر کھا جاتا تھا۔ وہ کھیت میں گھس جاتا تو کسی جنگلی بھینسے یا سوٗر کی طرح مرلہ مرلہ جگہ صاف کر دیتا۔ مولیاں، گاجریں، شلجم، خربوزے جو کچھ بھی ہوتا وہ فصل اجاڑ کر رکھ دیتا۔ گنے کا پھوک دیکھ کر لگتا جیسے بہت سا کماد بیلنے میں پیلا گیا ہو۔ یہی نہیں وہ چراگاہوں میں چرتی بھینسوں، گایوں اور بکریوں کا دودھ پی

جاتا۔ کئی بار اس کی پکڑ دھکڑ ہوئی اور اُسے مارا پیٹا گیا مگر وہ کبھی باز نہ آیا۔

لوگ اس سے ڈرتے بھی تھے اور اکیلا دکیلا آدمی اس سے اُلجھنے سے گریز کرتا تھا۔ اس سے دشمنی سہیڑنا بھی مہنگا پڑتا تھا اس کا کیا بھروسہ کب کیا اٹھا کر لے جائے۔

عالمے اپنی جوان بیٹی کے ہمراہ جب صُبح کو گھر گھر مانگنے جاتی تو اسے بھیک کی بجائے گالیاں اور شکایتیں ملتیں۔ وہ بیبیوں کو دُعائیں دیتی، ان کی ہاں میں ہاں ملاتی اور اوپرے دِل سے ناتو کو بد دعائیں دیتی جاتی۔

ایک بار میں گاؤں گیا تو پتہ چلا، ناتو شہر چلا گیا ہے۔ وہ شیرو کو اکثر دھمکیاں دیا کرتا تھا کہ میرا بیاہ کر دو ورنہ میں کسی عورت کو خود اُٹھا لاؤں گا یا پھر شہر چلا جاؤں گا۔ جہاں کوکے کولے پیئوں گا، پھل فروٹ کھاؤں گا اور جہاں مجھے کوئی نہ کوئی عورت بھی مل جائے گی۔

ناتو کے چلے جانے سے گاؤں والے خوش تھے مگر وہ جاتے جاتے جن بھوتوں کی طرح ہاتھ دکھا کر گیا تھا۔ پتہ نہیں یہ واقعہ پیش نہ آتا تو ابھی وہ شہر نہ جاتا

پنچایت کے سامنے شیرو اور عالمے کے بیانات سے پتہ چلا تھا کہ اس روز بڑی سردی تھی۔ ٹھنڈی برفانی ہوا چل رہی تھی اور بوندا بوندی ہو رہی تھی۔

اُس روز شیرو نے دارو کے نئے مٹکے کا ڈھکنا پہلی مرتبہ کھولا تھا اور دارُو کی بُو تالاب کے دوسرے کنارے تک پھیل گئی تھی۔ شیرو نمبردار کی مری ہوئی بھینس کا پانچ سات سیر گوشت کاٹ لایا تھا اور اُسے انگاروں پر بھون رہا تھا۔

ناتو سارے گاؤں میں باؤلے کُتے کی طرح ماس ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ بھیڑ بکریوں اور دوسرے جانوروں کا تازہ گوشت کھا کھا کر اب ناتو کو مُردار اچھا نہیں لگتا تھا۔ گاؤں کی گلیوں میں بچھڑے کے تازہ اور کچے گوشت کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ رحمو موچی کے گھر سے لوگ سیر دو سیر گوشت خرید کر نکلتے تو ناتو کا جی چاہتا وہ جھپٹ لے اور بھاگ جائے۔ اس نے رحمو موچی کے گھر میں جھانک کر دیکھا تھا وہاں بہت سے آدمی اور گوشت کاٹنے کے اوزار تھے۔ وہ پلٹ آیا۔

وہ دن علّکے کے سانپ ڈسوانے کے دن تھے مگر پتہ نہیں دُنیا بھر کے سانپ کس بل میں جا چھپے تھے۔ اس کا جسم پھوڑے کی طرح پک رہا تھا اور اُسے یوں لگتا تھا جیسے اس کے جسم سے زہر کے پرنالے ابھی ابھی بہنے لگیں گے۔

اگر اس کے ڈسوانے کے دن نہ ہوتے تو علّکے ناتو پر مادو کا راز کبھی نہ کھلنے دیتی۔ مگر اب ناتو مادو کو گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا ــــــ پتہ نہیں وہ اسے کہاں بیچ دے اور اس کے بدلے میں اپنا بیاہ رچا لے ــــــ علّکے نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی مگر ایک ہی دھکا کھا کر اٹھنے کے قابل نہ رہی تھی۔

ناتو کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر شیرو سے نہ رہا گیا وہ تلخی سے ہنس کر بولا:

"اسے نہ لے جا ــــ ناتو ــــــ یہ عورت نہیں ہے۔"

"عورت نہیں ہے"؟ ناتو کو جیسے سانپ نے ڈس لیا۔

"ہاں پُتّر ــــ یہ رب کی قدرت ہے ــــ یہ عورت ہے نہ مرد یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

پھر اس نے آگ پر گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے بھونتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی آہ بھر کر بولا:۔

"جب رب اسے بنانے لگا، مٹی کم پڑ گئی ــــــ رب کو اور بہت سے کام ہوتے ہیں اُس نے اور بہت کچھ بنانا ہوتا ہے۔"

ناتو نے غصّے سے رب کی طرف دیکھا مگر رب نے اُسے کوئی جواب نہ دیا۔

اس نے شیرو کی طرف دیکھا۔ وہ ادھ بھنا گوشت ہڑپ کئے جا رہا تھا۔

اس نے غصّے سے کہا "میں سب کو دیکھ لوں گا۔"

اس نے ٹوٹے ہوئے دروازے کو زور سے ٹھوکر مار کر گرا دیا اور باہر نکل گیا۔

اگلے روز چودھریوں نے ڈنگر ڈاکٹر کو بلوایا اور کہیں شام کو جا کر پتہ چلا کہ زندہ گائے کی

داہنی ران کو چیر کر سیر سوا سیر گوشت نکالا گیا ہے اور کھال میں بھُس بھر کر اُسے تندی سے سی دیا گیا ہے۔ لوگ ناتو کی تلاش میں نکلے مگر وہ کوکے کولے پینے اور پھل فروٹ کھانے کے لئے شہر چلا گیا تھا۔

میں نے آپ کو بتایا تھا کہ شہر میں کچھ عرصے سے چوری کی انوکھی وارداتیں ہو رہی ہیں چوروں کی ایک ٹولی بنگلوں میں گھُس کر کھانے پینے کی ہر چیز چٹ کر جاتی ہے۔

پولیس کا خیال ہے کہ اس ٹولی میں کم از کم چھ سات آدمی ہیں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ ایک ہی آدمی ہے جو کئی صدیوں سے بھوکا ہے۔

گھر سے باہر ایک دن

اندر سخت تاریکی، گھٹن اور اس کی اپنی ہی سوچوں کا تعفن پھیلا ہوا تھا۔

اگر اس اندھیرے میں گھڑی کے ڈائل کی طرح چمکتا اس کی بیوی کا وجود نہ ہوتا تو وہ کب کا گھٹ کر مر گیا ہوتا۔ اس کی بیوی اپنے معطر بدن کے علاوہ جہیز میں اپنے ساتھ سلائی مشین بھی لائی تھی اور اب سلائی کرتے کرتے اس کی ہڈیوں پر لپٹا ہوا دھاگہ ختم ہو چلا تھا۔ اور اس کی آنکھوں کی خوبصورت کشتیوں میں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہو گئے تھے۔ وہ ایک عرصے سے گھر کے ایک کونے میں دبکا ہوا تھا۔ وہ جب بھی باہر نکلنا چاہتا دیواروں سے لپٹا ہوا خوف اتر کر اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیتا لیکن پھر ایک روز اس کے پڑوسی علی احمد نے اسے اپنے گھر بلا کر ہدایت کی کہ وہ پرمٹ کے لئے درخواست دے۔ اسے شک گذرا۔ کہیں علی احمد نے اس کی بیوی کی ڈبڈبائی آنکھیں نہ دیکھ لی ہوں۔ پھر بھی گھر کی تاریکی دور کرنے اور بیوی کو مشین بن جانے سے بچانے کیلئے اس نے شک کا گلا گھونٹ دیا اور درخواست دے دی۔ علی احمد کسی بڑے دفتر میں تھا اس نے اسے چند روز بعد دفتر میں آنے کی ہدایت کی اور وہ ایک صبح دیواروں سے اتر کر بازوؤں میں جکڑ لینے والے خوف سے لڑ جھگڑ کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

گھر کی دہلیز سے آگے خلا تھا۔ وہ دور تک مکڑی کی طرح اپنے ہی تاگے سے لٹکتا چلا گیا۔ پتہ نہیں زمین کہاں تھی ـــــ تھی بھی یا نہیں۔ یا اس کے اندر تاگہ ختم ہو گیا تھا۔ بڑی دیر بعد اس کے پاؤں کسی سخت چیز سے ٹکرائے۔ شاید یہ زمین ہی تھی اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔

اس نے علی احمد سے ٹیلیفون پر وقت لے لینا مناسب سمجھا۔ ٹیلیفون کرنے کے لئے دس دس پیسے کے سکوں کی ضرورت تھی۔ اس نے جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکالا اور ریزگاری تلاش کرنے لگا۔ وہ بازار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہر دکاندار کے سامنے گڑگڑایا مگر اسے ریزگاری نہیں ملی۔ آخر ایک بھکاری سے دس پیسوں کے عوض اسے ریزگاری مل گئی۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہوا کہ بھکاری نے بیس یا تیس پیسے نہیں کاٹ لئے۔

ٹیلیفون بوتھ کی طرف جاتے جاتے اس نے ایک راہگیر سے وقت پوچھ لیا۔ راہگیر رُک گیا پھر اپنے گھڑی والے ہاتھ کو غرور سے اور اسے حقارت سے دیکھ کر بولا۔

"معاف کیجئے۔ یہ گھڑی میں نے اپنے لئے فارن سے منگائی ہے۔"

اُسے ہنسی آ گئی۔ راہگیر نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور بولا۔

"تم نے ضرور وقت دیکھ لیا ہوگا۔"

اس کا جی چاہا وہ رو پڑے اور اسے بتائے کہ اُسے وقت کا کچھ پتہ نہیں اور وقت کی چکنی دُم زندگی بھر اس کے ہاتھ نہیں آئی مگر اس نے بھاگنے میں عافیت سمجھی۔ وہ گریبان راہگیر کے ہاتھ میں چھوڑ کر بازار کے ہجوم میں گم ہو گیا۔ وہ ہانپ رہا تھا مگر اس کا دل اس خیال سے مسرور تھا کہ اب اسے بار بار گریبان میں جھانکنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اسی لمحے اس کی نظر آدمیوں کی ایک قطار پر پڑی۔ اس نے دیکھا قطار ہر لمحہ لمبی ہوتی جا رہی تھی اور اس سے پہلے کہ قطار اور لمبی ہو جاتی وہ بھاگ کر قطار میں شامل ہو گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے آگے اور پیچھے ایک جیسی قطار لگ گئی۔ وہ بے حد خوش تھا کہ اس نے قطار میں شامل ہونے کا سنہری موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا اور ایک اچھا فیصلہ صحیح وقت پر کیا۔ اگر وہ تھوڑی سی سستی کر دیتا تو قطار کے آخری سرے پر ہوتا۔ شاید قطار کا آخری آدمی ہوتا۔ وہ اپنی کمزور قوتِ فیصلہ کی وجہ سے زندگی کی قطار میں کبھی ٹھیک جگہ پر کھڑا نہیں ہوا تھا اور تو اور شادی کے فوراً بعد وہ بیوی کو فلم دکھانے لے گیا تھا۔ مگر جب وہ کھڑکی تک پہنچا ٹکٹ ختم ہو گئے تھے۔ اگر اس کی بیوی جلدی سے مستورات والی کھڑکی سے ٹکٹ نہ خرید لیتی تو وہ پہلی اور آخری فلم کبھی نہ دیکھ سکتا۔

قطار آگے کھسک رہی تھی۔ ہر پانچ منٹ بعد ایک آدھ قدم کا فاصلہ طے کرکے اسے لگ رہا تھا کہ وہ چاند اور ستاروں کو چھُو لینے کے لئے بلند ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ وہ آسمان سے ستارے توڑ لائے اور اپنی بیوی کا دامن بھر دے۔ ویسے اس کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آئی تھی کہ وہ ان ستاروں کا کیا کرے گی۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ اس کے پیچھے قطار دُور تک چلی گئی تھی۔ اس نے قطار کے اگلے سرے کا جائزہ لیا تو اس کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ زندگی میں پہلی بار وہ قطار میں صحیح مقام پہ تھا لیکن اسی لمحے جیسے کسی ریلوے انجن نے پیچھے سے ٹکر ماری ہو بڑے زور کا دھکا لگا۔ اس نے بے حد منت سماجت کی مگر اسے دوبارہ قطار میں گھُسنے نہیں دیا گیا۔ کافی دیر تک وہ قطار کے باہر کھڑا رہا پھر بادلِ نخواستہ وہاں سے چل دیا۔ ایک بار اُسے خیال آیا وہ پتہ تو کرے کہ قطار کس سلسلے میں لگی ہوئی تھی لیکن پھر اس نے سوچا کہ جب وہ قطار میں شامل ہی نہیں رہا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہاں مٹی کا تیل ملتا ہے۔ شکر ملتی ہے۔ آٹا ملتا ہے یا بس کے ٹکٹ ملتے ہیں۔ بس کے ٹکٹوں کا خیال آتے ہی اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے سوچا کہ یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ وہ قطار سے باہر آگیا ورنہ اگر وہ بس کے ٹکٹ خرید لیتا تو پتہ نہیں۔ بس اسے کس شہر میں اور کہاں لے جاتی !

ٹیلیفون بوتھ پر بھی قطار لگی تھی مگر وہ اتنی لمبی نہیں تھی۔ بوتھ کے اندر والا شخص ٹیلیفون پر کسی کو الجبرے کے سوال حل کرا رہا تھا۔ قطار میں شامل لوگ بھی اپنی اپنی نوٹ بکوں پر سوال حل کر رہے تھے اس کے پاس قلم تھا نہ نوٹ بک۔ ناچار اُسے اپنی یادداشت پر بھروسہ کرنا پڑا۔ پھر جب اندر والے نے سوال کا جواب لامساوی صفر نکالا تو باہر کھڑے لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کسی کا جواب دوسرے سے نہیں ملتا تھا۔ اس کے پیچھے والے کا جواب لامساوی سات تھا شاید اس لئے کہ وہ ساتویں نمبر پہ کھڑا تھا۔ اس کے آگے والے کا اصرار تھا کہ لامساوی پانچ درست جواب ہے۔ اس اختلاف نے جلد ہی جھگڑے کی صُورت اختیار کر لی اور شاید صورتِحال بے حد نازک ہو جاتی اگر کہیں سے ہوائی حملے کے خطرے کا سائرن نہ بجنے لگتا۔ اس اتنے معمولی جھگڑے پر ہوائی حملے کا سائرن سُن کر اسے حیرت ضرور ہوئی مگر حیران ہونے سے پناہ لینا زیادہ بہتر تھا۔ اُسے نہیں پتہ اندر والا اور باہر والے کدھر گئے اور کن پناہ گاہوں میں چھپے، وہ ٹیلیفون بوتھ کے عقب میں زمین پر چت لیٹا ہوا

تھا اور اسے اپنی بیوی اور وہ بچے جو ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے یاد آ رہے تھے اور اس کا دل خوف اور صدمے سے کانپ رہا تھا۔ اسی لمحے کوئی قریب سے گزرا اور ہنس کر بولا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سائرن ٹسٹ کئے جا رہے ہیں۔"

اس کی جان میں جان آئی۔ وہ بھاگ کر ٹیلیفون بوتھ میں گھس گیا اور سکّے ڈال کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ جواب میں کسی خاتون نے اسے گندی گالی دی اور فون بند کر دیا۔ اس نے دوبارہ کوشش کی۔ کسی بہرے شخص نے ٹیلیفون پر پانچ سات مرتبہ ہیلو ہیلو کہا اور فون بند کر دیا۔ تیسری بار اس نے وقت بتانے والی انکوائری کا نمبر ملایا اور خوبصورت نسوانی آواز کا لطف اٹھانے لگا۔ کافی دیر بعد جب باہر لمبی قطار لگ گئی اور طرح طرح کی آوازیں آنے لگیں تو وہ گھبرا کر باہر آ گیا۔ باہر آ کر اسے یاد آیا اس نے وقت تو نوٹ ہی نہیں کیا۔

گھر سے نکلے اسے کافی دیر ہو گئی تھی اور اب بھوک ستا رہی تھی وہ کسی سستے سے ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھانا چاہتا تھا لیکن پھر اسے یاد آیا کہ سستے ہوٹلوں پر مردہ گدھوں، گھوڑوں اور کتوں کا گوشت اور ناقص غذا فروخت ہوتی تھی۔ اس لئے حکومت نے تمام سستے ہوٹلوں کو قانوناً بند کر دیا تھا اور اب شہر میں صرف جنگلے اور اعلیٰ درجے کے ہوٹل تھے جہاں عام آدمی ہفتے میں ایک وقت کا کھانا کھاتا اور باقی دن اس کی جگالی کر کے گزارتا تھا۔ یا پھر دودھ دہی اور مٹھائی کی دکانیں تھیں۔ جہاں گاہک کی آنکھوں کے سامنے دودھ میں پانی ملایا اور منہ مانگی قیمت وصول کی جاتی تھی۔ اعتراض کرنے پر پہلوان کڑچھا مار کر سر توڑ دیتے تھے۔ کھانے پینے کا خیال ترک کر کے وہ علی احمد کے دفتر کی جانب چلنے لگا۔

دفتر کے صدر دروازے پر چوکیداروں کا پہرہ تھا۔ اس نے اپنا شناختی کارڈ دکھایا۔ شناختی کارڈ پر اس کی دو سال پہلے کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ دو سالوں میں اُس کی صورت اس قدر مسخ ہو چکی تھی، اس کا اُسے اس وقت پتہ چلا جب اُسے مشکوک سمجھ کر گرفتار کیا جانے لگا۔ لیکن اسی لمحے دو میں سے ایک چوکیدار کی نظر اس کے شناختی کارڈ پر درج لفظ "مور" پر پڑ گئی۔ اس نے درشت لہجے میں کہا۔

"مور کو حاضر کیا جائے۔"

مور جیسا قیمتی اور نایاب پرندہ وہ زندگی بھر حاضر نہیں کر سکتا تھا وہ پریشان ہو گیا لیکن پھر فوراً ہی اُسے یاد

آگیا۔اس نے آستین اوپر چڑھائی اور بازو پر کھدا ہوا مور دکھایا اور یہ جان کر کہ چوکیدار مطمئن ہو گیا ہے اور اس نے زندہ مور حاضر کرنے پر اصرار نہیں کیا، اُسے اطمینان ہوا لیکن اسی لمحے دوسرے چوکیدار نے کہا۔

"ابے یہ تو مورنی ہے۔"

"مورنی کے اتنے بڑے پَر نہیں ہوتے" پہلے نے جواب دیا۔

"ہوتے ہیں۔ یہ مورنی ہے۔"

"مور ہے۔"

"مورنی ہے"

"مور تمہارا چاچا لگتا ہے۔"

"مورنی تمہاری بے بے لگتی ہے۔"

دونوں نے ایک دوسرے پر مکّے تان لئے۔ اس نے موقع کو غنیمت جانا اور بھاگ کر اندر چلا گیا۔

کاریڈوروں میں چپڑاسی، فراش اور دفتری بیٹھے تاش کھیل رہے تھے ساتھ ساتھ دفتر کی چٹھیوں اور فائلوں پر تبصرے کر رہے تھے اس نے انہیں سلام کیا اور علی احمد کا پتہ پوچھا مگر کسی نے اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا وہ خود ہی ایک ایک کمرے میں علی احمد کو تلاش کرنے لگا۔ اس نے دیکھا کچھ لوگ حاملہ فائلوں کے بوجھ تلے پڑے کراہ رہے تھے کچھ موٹی موٹی لغاتوں میں کسی اجنبی زبان کے لفظوں کے ہجے اور معنی تلاش کر رہے تھے کسی کسی جگہ کوئی خاتون بھی نظر آجاتی تھی جو بانجھ فائلوں کے انبار پر نیم دراز افسروں کے سروں کی مالش کرنے یا پاؤں میں گدگدیاں کرنے میں مصروف ہوتی۔

آخر اس چپڑاسی نے جس کی محلے میں اسٹیشنری کی دکان بھی تھی اسے پہچان لیا اور علی احمد کے کمرے تک پہنچا دیا۔

علی احمد نے گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ پھر اس کی فائل منگائی اور بتایا کہ ضابطہ نمبر ۵ کی شق نمبر آٹھ کے جزو نمبر پانچ الف الف بے کی رُو سے اس کی درخواست نامکمل ہے۔ ضابطے کی ترمیم نمبر ۱۱ کی رُو سے اسے بیان ملفی اور ترمیم نمبر چھ ضمیمہ جیم کی رُو سے کیریکٹر سرٹیفیکیٹ درخواست کے ساتھ منسلک کرنا ہو گا۔ نیز

وضاحت نمبر۹ اور منظر ثانی شدہ ترمیم نمبر چار کے تحت سرکاری خزانے میں سو روپے فیس جمع کرانی ہوگی جو مین ہیڈ سات سو چھیاسی اور سب ہیڈ پینتالیس الف الف دال کے تحت جمع ہوگی۔

سو روپے کا نام سن کر وہ پریشان ہو گیا۔ علی احمد نے اس کی پریشانی بھانپ لی اور بولا "کوئی بات نہیں میں خود جمع کرا دوں گا، اب تمہارے دن پھر جائیں گے مگر تمہیں معاہدہ کرنا ہوگا۔"

"کیسا معاہدہ؟"

"تمہاری ہر چیز میں میرا حصہ پچاس فیصد ہوگا۔"

ایک ناگوار سی سوچ مکھی کی طرح اس کے چاروں طرف بھنبھنانے لگی اس نے پوچھا۔

"ہر چیز میں؟"

"ہاں ہر چیز میں"

اس نے فائل سے درخواست نکال کر پھاڑ دی اور بوجھل قدموں سے باہر نکل آیا۔

ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ پیچھے سے آنے والی ایک کار نے اُسے ٹکر مار دی اور اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔ اس کی پسلیاں چٹخنے لگیں اور گھٹنے کے نیچے ٹانگ ٹوٹ گئی۔ کار والا کار روک کر قریب آیا اور بولا "حرام زادے اگر ڈنٹ پڑ جاتا تو؟"

اُسے خون کی قے ہو گئی۔ کار والا ناک پر رومال رکھ کر اور نفرت سے منہ پھیر کر چلا گیا۔ پھر ایک ٹیکسی قریب آ کر رُکی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اس کی حالت دیکھ کر کہا "ہسپتال لے چلوں؟"

"ہاں آپ کی بڑی مہربانی۔"

"مہربانی نہیں۔ پچاس روپے لگیں گے۔"

"ڈیڑھ دو میل سفر کے لئے یہ تو بہت زیادہ ہیں۔"

"اس مہنگائی کے دور میں ایسے موقعوں پر ہی تو ہمیں بھی چار پیسے بچتے ہیں۔"

میرے پاس کُل بیس روپے دس پیسے ہیں جو میری بیوی نے "

"چلو تم بیس روپے دس پیسے ہی دے دو۔ لیکن پیشگی۔ کیا پتہ تم راستے میں مر جاؤ اور جیبوں کی تلاشی

سینے پر کچھ بھی نہ ملے"۔

ہسپتال کے بستر پر لیٹے لیٹے اس نے ڈاکٹر کی آواز سُنی۔

"سسٹر اس کی صرف ایک ٹانگ ٹوٹی ہے ہوشیار رہنا کہیں آٹھ نمبر کی طرح یہ بھی بستر کی چادر اور تکیے لے کر غائب نہ ہو جائے"۔

پھر اس نے پانچ نمبر کی چیخ سُنی "ہائے میرا گردہ"۔

"تمہارے گردے کو کیا ہوا ہے؟"

"پیٹ کے آپریشن کے دوران انہوں نے میرا گردہ چوری کر کے کسی اور کو لگا دیا ہے۔ ان کی ماں کی"

اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنی ٹانگوں، کانوں، آنکھوں اور بازوؤں کو چھوا اور پھر یہ جان کر کہ اس کے تمام اعضاء موجود ہیں، اس نے دل ہی دل میں خُدا کا شکر ادا کیا۔ شام کو ہسپتال میں اور بہت سے سیریس کیس آ گئے تو انہوں نے اُسے اچانک فارغ کر دیا تاہم ایمبولینس کے ذریعے اسے اس کے گھر پہنچا دیا گیا۔

وہ گھر پہنچا۔

اس کی بیوی جس کی ہڈیوں پر لپٹا ہوا دھاگہ ختم ہو چلا تھا مگر جس کی ڈبڈبائی آنکھیں اندھیرے میں گھڑی کے ڈائل کی طرح چمکتی تھیں اُسے اس حالت میں دیکھ کر رو پڑی۔ اس نے کہا بھاگوان یہ رونے کا نہیں خوش ہونے کا موقع ہے۔ میں حادثے میں مر بھی تو سکتا تھا لیکن میں زندہ ہوں۔ اُٹھو اور شکرانے کے نفل ادا کرو"۔

نئی دستک

ابا کی اور میری گہری دوستی تھی۔ اس دوستی کی وجہ سے مجھ میں بڑی خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ میں چاہتا تھا کہ جمی سے بھی میری ایسی ہی دوستی ہو جیسی میری اور ابا کی تھی۔ میں اور ابا ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب میں جمی کی عمر کا تھا تو یہی جی چاہتا تھا کہ ہر بات کی تہہ میں جاؤں اور ہر معاملے میں اپنا شک دُور کروں۔ ابا میرے بے تکے سوالوں سے کبھی پریشان نہ ہوتے تھے۔ اور نہ کبھی جھنجھلاتے تھے بلکہ مجھے اکثر مطمئن کر دیا کرتے تھے۔ لیکن میں جمی کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ اُسے بھی کرید کی عادت ہے اور وہ بھی اپنا علم بڑھانا اور شک دُور کرنا چاہتا ہے۔ میں اکثر کوشش کرتا ہوں کہ اُسے مطمئن کروں لیکن عموماً مجھے اس کا دوست نہیں بلکہ باپ بن کر جواب دینا پڑتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ اُس کی شخصیت کی نشو و نما کے لئے نقصان دہ ہے لیکن اس کے سوا مجھے کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ مثلاً پچھلے برس کی بات ہے اوپر کے کام کے لئے ہم نے سجادل نامی ایک لڑکے کو ملازم رکھ لیا۔ جمی کو ایک نیا موضوع ہاتھ آ گیا۔

"ابو! سجادل اپنے ماں باپ کے پاس کیوں نہیں رہتا؟"

"بیٹے وہ ہمارے یہاں ملازم ہے اسے تنخواہ ملتی ہے۔"

"تنخواہ! ــــ آپ کو بھی تنخواہ ملتی ہے ابو؟"

"ہاں بیٹے ملتی ہے۔"

"آپ بھی دفتر میں اوپر کا کام کرتے ہیں؟"

"میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہوں۔ کبھی کبھی اوپر کا کام بھی کرنا پڑتا ہے۔"

"ابّو سجاول کیوں نہیں پڑھتا۔ آپ اُسے میرے ساتھ سکول کیوں نہیں بھیجتے؟"

"بیٹے ۔۔۔ اس کے ماں باپ غریب ہیں وہ اسے پڑھا نہیں سکتے۔"

"سجاول کے ماں باپ غریب کیوں ہیں ابّو؟"

"اس لئے بیٹے کہ وہ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔"

"سجاول بھی غریب ہے ۔۔۔ ہے نا ابّو؟"

"ہاں"

"ہم امیر ہیں ابّو؟"

"نہیں بیٹے ہم نہ امیر ہیں نہ غریب۔"

"تو پھر کیا ہیں ابّو؟"

"ہم امیر بننے کی فکر میں رہتے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ درمیان میں ہیں۔"

"تو پھر سجاول کو بھی سکول بھیجا کریں نا ابّو ۔۔۔ وہ بھی امیر ہو جائے گا۔"

"نہیں بیٹے اس کا کام برتن دھونا اور گھر کی صفائی کرنا ہے۔"

"میں بھی سکول نہیں جاؤں گا۔ سجاول کے ساتھ کام کروں گا۔"

"بُری بات ہے بیٹے ۔۔۔ اچھے بچے سکول جاتے ہیں۔"

"سجاول اچھا بچہ نہیں ہے ابّو؟"

"اوہو۔ تم خاموش نہیں ہو گے؟"

"آپ ۔۔۔ بتو؟"

آواز جمی کے حلق میں کٹ کر رہ جاتی اور مجھے ایسا لگتا جیسے میں نے اس کی بات کا تسلی بخش جواب نہ دے کر اس دوستی اور اعتماد کے جذبے کو ٹھیس پہنچائی ہے جو میں جمی سے قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ جمی کی روز روز کی تکرار سے پریشان ہو کر ہم نے سجاول کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا اور

جمّی سے کہہ دیا کہ اب وہ اپنے ماں باپ کے ہاں مزے سے رہتا اور سکول جاتا ہے مگر کچھ ہی عرصے بعد جب ہمارے پڑوسی شیخ صاحب نے نئی کار خریدی تو جمّی کو دوسرا موضوع مل گیا۔

"ابوّ آپ سکوٹر بیچ کر کار خرید لیں"

"کار مہنگی ہوتی ہے بیٹے ــــ زیادہ پیسے خرچ ہوتے ہیں"

"کتنے زیادہ"؟

"بہت زیادہ"

"تو آپ چھوٹی والی لے لیجئے ابوّ"

"اس کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں"

"امّی کے پاس ہیں ان سے لے لیجئے"

"وہ تو گھر کے خرچ کے لئے ہیں"

"میرے گلّے میں بھی ہیں"

"اتنے پیسوں میں کار نہیں آتی"

"آپ حبیب بنک سے لے لیجئے"

"حبیب بنک سے صرف اس کو پیسے ملتے ہیں جس نے وہاں جمع کرائے ہوں"

"آپ جمع کرا دیجئے نا"

"میری تنخواہ تھوڑی ہے مشکل سے گزارہ ہوتا ہے"

"پپّو کے ابّا سے بھی تھوڑی"؟

"ہاں وہ میرے افسر ہیں۔ ان کی تنخواہ مجھ سے زیادہ ہے"

"پپّو کے ابّا آپ سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں"؟

"نہیں بیٹے ــــ جب میں کالج میں پڑھاتا تھا تو وہ میرے شاگرد تھے مگر اب ان کی ترقی ہو گئی ہے اور میں ان کے ماتحت کام کرتا ہوں"

"آپ کی ترقی کیوں نہیں ہوئی ابّو"

"ترقی کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے"

"آپ کرتے کیوں نہیں ابّو"؟

"بیٹے تم نہیں سمجھوگے بس اب چپ ہوجاؤ۔ مجھے پریشان نہ کرو"

میں جانتا ہوں۔ مجھ سے زیادہ خود جمّی پریشان ہوجاتا ہے۔ اس کا چہرہ مرجھا جاتا ہے اور وہ آنکھیں جھکا کر کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے۔ مجھے اس کے ذہن پر پھیلا ہوا اندھیرا محسوس ہوتا رہتا ہے۔ اس اندھیرے میں اعتماد، یقین، اور سچائی کا دیا روشن کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ اندر ہی اندر سُلگنے لگا ہے۔ اندر ہی اندر مجھ سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ میں اس سے دُور نہیں ہونا چاہتا۔ میں اسے اعتماد میں لینا چاہتا ہوں اور اس سے دوستی چاہتا ہوں جیسی میری آبا سے تھی۔ بے لاگ۔ پُر اعتماد اور سچّی! ــــ آبا مجھے شک میں مبتلا نہیں ہونے دیتے تھے۔ ہر بات صاف صاف مجھ سے کہہ دیتے تھے خواہ اس کے لئے انہیں اپنی لغزشوں اور جوانی کی بے اعتدالیوں کا اعتراف ہی کیوں نہ کرنا پڑتا لیکن میں جمّی سے صاف صاف بات نہیں کر سکتا۔ کوشش ضرور کرتا ہوں مگر ناکام رہتا ہوں۔ اپنی ناکامی سے مجھے خوف آنے لگتا ہے کہیں جمّی مجھ سے نفرت نہ کرنے لگے۔ اس کی شخصیت ادھوری نہ رہ جائے۔ وہ خود اعتمادی سے محروم نہ ہوجائے۔ میں پھر نئے سرے سے عزم کرتا ہوں اور اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہوں وہ پوچھتا ہے۔

"ابّو آج پھر اخبار میں بچوں کے اغوا کی خبر چھپی ہے"

"ہاں چھپی ہے"

"تصویر بھی ہے ابّو ـــ اس گڑھے کی جہاں بچوں کو قتل کرکے پھینکا جاتا ہے"

"ہاں میں نے دیکھی ہے"

"ابّو وہ بچوں کا کیا کرتے ہیں"؟

"انہیں قتل کر دیتے ہیں۔"

"کیوں کرتے ہیں؟"

"دیکھو جمی کسی بچی نے سونے کی بالیاں پہنی ہوں تو بالیاں اُتار کر بچی کو اس لئے قتل کر دیتے ہیں کہ پکڑے جائیں تو بچی شناخت نہ کر سکے۔"

"اور لڑکے ـــــ وہ تو بالیاں نہیں پہنتے ابّو۔"

"بیٹے یہ بُرے لوگ ہیں۔ بس قتل کر دیتے ہیں۔"

"مگر کیوں ابّو ـ کس لئے؟"

میں لمحہ بھر کے لئے خاموش ہو جاتا ہوں۔ پھر دل کڑا کر کے سچ بولنے کی ناکام کوشش کرتا ہوں۔

"جمی بیٹے ـــــ وہ بُرے لوگ بچوں سے بدفعلی......."

الفاظ میرے حلق میں اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ جمی پوچھتا ہے۔

"ابّو بدفعلی کیا ہوتی ہے؟"

"بُری بات ہوتی ہے بیٹے۔ بہت بُری بات۔ بس اب تم چپ ہو جاؤ۔"

جمی چپ ہو جاتا ہے لیکن مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ چیخ چیخ کر مجھ سے اپنے سوال کا جواب پوچھ رہا ہے۔ میں اس کی کس کس بات کا جواب دوں اور کہاں تک دوں! چند ماہ پہلے کی بات ہے میں اپنے ایک رشتہ دار عبدل سے جیل میں ملاقات کے لئے گیا۔ عبدل پر قتل کا مقدمہ چل رہا تھا اور وہ حال ہی میں ہمارے شہر کی جیل میں منتقل ہوا تھا۔ اتفاق سے وہ دن عبدل کی ملاقات کا نہیں تھا۔ میں نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو چٹ بھیجی کہ میں دفتر سے شارٹ لیو لے کر آیا ہوں مہربانی کر کے مجھے عبدل سے ملاقات کی اجازت دی جائے۔ سپرنٹنڈنٹ نے مہربانی کی اور عبدل کو ملاقات کے کٹہرے میں بھجوا دیا۔ عبدل اس خلاف توقع ملاقات سے بہت خوش ہوا۔ میں بسکٹ اور سگریٹ کے چند پیکٹ ساتھ لے گیا تھا۔ عبدل یہ چیزیں پا کر اور بھی خوش ہوا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس کو بری کروانے کی کوشش کروں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ قاتل ہے اور اس کو سزا ملے گی۔ پھر بھی میں نے

اس کی تسلی کے لئے رسماً کہہ دیا۔

"تم فکر نہ کرو عبدل۔ خدا بہتر کرے گا۔"

اتفاق ایسا ہوا کہ اس کے بعد کی پیشی میں عدالت نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور عبدل شک کی رعایت سے بری ہو گیا۔ اس اچانک رہائی کی وجہ خود عبدل کی سمجھ میں نہ آتی تھی اور اس کے خاندان والوں نے اندازہ لگایا کہ میں نے عبدل سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا ہے اور سب کچھ میری سفارش سے ہوا ہے۔ مجھے گھر بیٹھے بٹھائے پیغمبری مل گئی۔ برادری میں میرے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ اظہارِ تشکر کے لئے رشتہ داروں کا تانتا بندھ گیا۔ تحفے آئے۔ تعریفی خطوط آتے اور پتہ نہیں کیا کیا۔ یہاں تک کہ خود مجھے یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ سب کچھ میں نے ہی کیا ہو گا۔ پتہ نہیں جمی کے کان میں اس واقعہ کی بھنک کیسے پڑ گئی۔

ایک رات وہ ٹیلی ویژن پروگرام دیکھ کر میرے کمرے میں آیا اور میرے ساتھ لیٹ کر بولا۔

"ابّو ——— چچا عبدل کو آپ نے رہا کرایا"؟

"نہیں ——— ہاں بیٹے!"

"ورنہ اُن کو پھانسی ہو جاتی؟"

"یقیناً"

آپ نے بہت اچھا کیا ان کو پھانسی سے بچا لیا۔ ابّو آپ کتنے اُچھے ہیں" میرے دل پر چوٹ لگی۔ میں نے سوچا کاش میں ایسا ہوتا۔ پھر بھی میں خوش تھا کہ جمی کے دل میں میرے لئے اچھے جذبات تھے۔ جمی کو نیند آئی ہوئی تھی وہ جلد ہی سو گیا۔ ورنہ مجھے ڈر تھا کہ وہ کُرید کُرید کر مجھے پریشان کرے گا۔ لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ کچھ ہی دنوں بعد عبدل کی شادی طے پائی تو عبدل اور اس کے گھر والوں نے ہمیں خاص طور پر بلایا۔ میری بیوی گاؤں کی شادیوں سے کتراتی ہے لیکن عبدل کی شادی پر جانے کے لئے وہ بھی زور و شور سے تیاریاں کرنے لگی۔ کیونکہ ہم دونوں جانتے تھے کہ عبدل کے ہاں ہماری غیر معمولی آؤ بھگت ہو گی بلکہ ہمیں یوں لگتا تھا جیسے یہ عبدل کی شادی نہیں ہماری تاجپوشی

کا جشن ہے۔ جس روز ہم عبدل کے گاؤں پہنچے، اگلے روز برات کو ساتھ والے گاؤں میں جانا تھا۔ صبح جب میں کپڑے تبدیل کر چکا تو جمی میرے پاس آیا اور سہمی ہوئی آواز میں بڑے رازدارانہ لہجے میں بولا۔

" ابّو یہ جو چچا عبدل ہیں جن کی شادی ہے انہوں نے اکبرے کو قتل کیا تھا۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے پوچھا۔

" تمہیں کس نے بتایا ؟"

" سب بچوں کو پتہ ہے آپ کو نہیں پتہ ؟"

" نہیں۔" میں نے مشکل سے جواب دیا۔ جمی چپکے سے بولا

" چچا عبدل نے اکبرے کے پیٹ میں بلم بھونک دیا تھا۔ ابّو بلم کیا ہوتا ہے ؟"

" لاٹھی کے سرے پر چھری سی لگی ہوتی ہے۔"

" سب کے سامنے مارا تھا۔" جمی نے کہا "پھر پولیس پکڑ کر لے گئی۔"

میں پریشان ہو گیا۔ میں اسے ڈانٹنا چاہتا تھا لیکن ہمت نہ ہوئی وہ بولا

" ابّو آپ کو پتہ نہیں تھا۔ اس لئے آپ نے انہیں جیل سے رہا کرایا ہے نا !"

" ہاں بیٹے مجھے پتہ نہیں تھا۔"

" پولیس کو بھی پتہ نہیں تھا۔"

جمی میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی زبان سمجھ رہا تھا۔ مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دے چنانچہ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

" تم ہر بات میں اپنی ٹانگ نہ اڑایا کرو جمی ۔ جاؤ باہر جا کر کھیلو۔"

جمی اداس نظروں سے مجھے دیکھتا ہوا باہر نکل گیا اور مجھے ایسا لگا جیسے میں ہمیشہ کے لئے اس کی دوستی اور اعتماد سے محروم ہو گیا ہوں

اوورٹائم

اُسے اکثر دفتر بند ہو جانے کے ایک گھنٹہ بعد تک اوورٹائم بیٹھنے کی اجازت مل جاتی تھی اور ایک روپیہ فی گھنٹہ کے حساب سے بیس پچیس روپے ماہوار تنخواہ سے زیادہ مل جاتے تھے اس نے کئی بار کوشش کی تھی کہ اسے ایک گھنٹہ مزید اوورٹائم کام کرنے کی اجازت مل جائے لیکن اس کے انچارج نے کبھی اس کی منظوری نہیں دی تھی۔

آج بھی وہ دفتر بند ہو جانے کے ایک گھنٹہ بعد گھر جانے کے لئے باہر نکل رہا تھا کہ چوکیدار نے اسے جی ایم صاحب کی والدہ کے انتقال کی خبر سنائی۔

دُکھ کی ایسی خبروں میں جن کا تعلق کسی دوسرے سے ہو آدمی کے لئے اطمینان کا ایک پہلو بھی موجود ہوتا ہے کہ یہ حادثہ یا المیہ اس کے اپنے ساتھ پیش نہیں آیا۔ اس نے بھی یہ خبر ایسے ہی اطمینان بخش ملال کیساتھ سُنی ویسے بھی اس کا جی ایم صاحب سے براہ راست کوئی تعلق یا واسطہ نہیں تھا البتہ پچھلے ہفتے اس نے اپنی ترقی کے لئے ان کے نام ایک اپیل تحریر اپر چینل بھجوائی تھی جس میں ذاتی طور پر حاضر ہونے اور اپنا موقف پیش کرنے کی اجازت بھی مانگی تھی اور وہ اسی روز سے پریشان اور خائف تھا کہ وہ ان کا سامنا کیسے کرے گا اور اپنا موقف کس طرح بیان کرے گا اس کے اور جی ایم صاحب کے درمیان بہت فاصلہ تھا۔ درمیان میں کتنے ہی بڑے بڑے افسران دشوار گذار پہاڑوں کی طرح ایستادہ تھے جن کے سامنے جا کر اس کی ٹانگیں کانپنے اور زبان لڑکھڑانے لگتی تھی پھر وہ سب سے بڑے افسر جی ایم صاحب کا سامنا کیسے کرے گا

افسروں کے سامنے اس کے ہمیشہ بلاوجہ ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے۔

اس نے پلٹ کر آر اینڈ آئی برانچ اور ٹیلیفون ایکسچینج میں جھانکا۔ آر اینڈ آئی برانچ کا مختصر سا عملہ خوش گپیوں میں مصروف تھا اور ٹیلی فون ایکسچینج کے دوسری شفٹ کے آپریٹرز تیزی سے مختلف نمبر ڈائل کرنے، افسران کو ان کی اقامت گاہوں پر اطلاع دینے اور نمازِ جنازہ کا وقت بتانے میں مصروف تھے اسے خیال آیا کہ اگر وہ جی ایم صاحب کے بنگلہ پر اظہارِ تعزیت کرنے اور نمازِ جنازہ میں شرکت کے لئے چلا جائے تو جونیئر اسٹاف کی غیر موجودگی میں اس کی اہمیت بہت بڑھ جائے گی اور جب وہ جی ایم صاحب کے سامنے اپنی اپیل کے سلسلے میں حاضر ہوگا تو "فی الحال نہیں" لکھتے یا کہتے وقت ان کی نگاہوں میں اپنی والدہ کا جنازہ گھوم جائے گا اور وہ "منظوری دی جاتی ہے" لکھ دیں گے اس خوشگوار خیال کے ساتھ ہی نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے اندر اگربتی سی سلگنے لگی اور اس کا سارا اندر خوشبودار دھوئیں سے بھر گیا۔

اس نے جی ایم صاحب کے بنگلے پر جانے کا تہیّہ کر لیا لیکن ابھی جنازہ اٹھنے میں خاصی دیر پڑی تھی اور اگرچہ اسے پتہ تھا کہ تعزیت کے لئے جانے میں تھرو پراپر چینل کے دفتری ضابطے لاگو نہیں ہوتے پھر بھی اس کا اپنے سینئر افسران سے پہلے جی ایم صاحب کے بنگلے پر پہنچ جانا مناسب نہیں تھا۔

ایک بار اس نے سوچا کہ وہ پہلے اپنے گھر چلا جائے اور کھانا کھانے اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد جی ایم صاحب کے ہاں جائے لیکن اس طرح دُگنا کرایہ خرچ ہونا تھا اور پھر اسے ڈر تھا کہیں اڑوس پڑوس میں اس کا کوئی کولیگ نہ مل جائے وہ اگلے روز دفتر میں سب کو جی ایم صاحب کے بنگلے پر جانے نمازِ جنازہ میں شرکت کرنے اور جی ایم صاحب سے ہمکلام ہونے کی خبر سُنا کر حیرت میں ڈال دے گا اور کم از کم اس کے انچارج کی آنکھیں ضرور کھل جائیں گی جنہیں آدمی کی بالکل قدر نہیں تھی۔

وہ دفتر سے نکل کر خوش خوش بس اسٹاپ پر آیا اور بس میں سوار ہو کر اس چوک پر اُتر گیا جہاں سے ایک سڑک جی ایم صاحب کے بنگلے کی طرف جاتی تھی ابھی جنازہ اٹھنے میں کافی دیر تھی اس لئے وہ ٹہلتا ہوا قریبی سینما ہاؤس میں آگیا اور پوسٹر اور تصویریں دیکھنے لگا۔ کافی عرصے سے اس نے فلم نہیں دیکھی تھی۔

گھر کے اخراجات پورے نہ ہوتے تھے اُوپر سے بیوی اکثر بیمار رہتی تھی اور اس کے علاج معالجے پر خاصے پیسے خرچ ہو جاتے تھے جب بھی اس کا جی فلم دیکھنے کو چاہتا وہ کسی سینما ہاؤس کا رُخ کرتا اور "آج شب کو" والے بورڈ پر لگی سٹلز (STILLS) دیکھ کر فلم کی کہانی اور موضوع کا اندازہ کر لیتا تھا۔ بعض سینما ایسے تھے جہاں باہر کھڑے ہو کر مکالمے اور گانے بھی سُنائی دیتے تھے اس نے دیکھا ـــــ اس فلم میں ہیروئین کو نہایت غریب دکھایا گیا تھا۔ کہیں وہ جھاڑو دے رہی تھی کہیں بوجھ اُٹھا رہی تھی اور ایک تصویر میں برتن دھو رہی تھی قریب ہی مالکن جو شاید ہیرو کی ماں بھی تھی کولہوں پر ہاتھ رکھے کھڑی اسے کسی بات پر بُرا بھلا کہہ رہی تھی ایک اور تصویر میں ہیروئین ایک بہت بڑے شاپنگ پلازا میں ششدر کھڑی تھی اس کے سامنے رنگا رنگ ملبوسات بکھرے پڑے تھے وہ پریشان ہو گیا وہ یہاں کیسے آ گئی۔ لیکن پھر اس کی نظر ایک اور تصویر پر پڑی وہ خوش شکل ہیرو کے ساتھ کار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ فلم شروع ہو چکی تھی اور بند دروازوں سے چھن چھن کر موسیقی میں لپٹی ہیرو اور ہیروئین کے گانے کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں شاید یہ اسی سین کا گانا تھا۔

اس نے بہت سی تصویروں پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور ہیرو ہیروئین کی شادی کی تصویر ڈھونڈنے لگا ایک تصویر میں ہیروئین کو دُلہن بنایا جا رہا تھا۔ بیک گراؤنڈ میں جھونپڑی نما مکان اور معمولی قسم کے لوگ نظر آ رہے تھے شاید امیر کبیر دولہا کی برات آنے والی تھی اس نے اطمینان کا لمبا سانس لیا اور باہر آ گیا وہ سوچ رہا تھا اس کی ترقی ہو گئی اور اس کی تنخواہ میں اضافہ ہو گیا تو وہ ہر ماہ کم از کم ایک فلم ضرور دیکھے گا کبھی کبھی بیوی کو بھی ساتھ لے آیا کرے گا۔ اُسے جی ایم صاحب کی والدہ کا خیال آیا یقیناً وہ نیک عورت تھی جس نے مر کر اُسے جی ایم صاحب کی نظروں میں آنے اور اپنا بل منظور ہو جانے کا موقع بخشا تھا اسے جی ایم صاحب پر بھی ترس آنے لگا ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ ماں کو نہیں مرنا چاہیئے خواہ کسی کی ماں ہو ماں مر جائے تو لگتا ہے زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی اور آدمی خلا میں معلق رہ گیا۔

باہر آ کر اس نے چنے خریدے نل سے پانی پیا اور پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا دوبارہ اس سڑک پر آ گیا جو جی ایم صاحب کے بنگلے کی طرف جاتی تھی۔ اچانک ایک بس گھوڑا گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ گاڑی بان

بس ڈرائیور کو گندی گالیاں دیتا ہوا مریل گھوڑے کو بری طرح پیٹنے لگا گھوڑے کی پیٹھ پر بڑے سے کھرنڈ سے خون بہنے لگا وہ لمحہ بھر کے لئے گھوڑے کی جگہ جت گیا اور چابک کھانے اور درد سے بلبلانے لگا لیکن پھر یہ جان کر کہ وہ تو مرنے سے فٹ پاتھ پر جا رہا ہے وہ سگریٹ سلگا کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔

سڑک کے دونوں جانب اونچے اونچے خوبصورت درخت تھے جن کے تنوں کو سفید رنگ سے پینٹ کیا گیا تھا۔ آس پاس پھول۔ پودے اور ہری بھری گھاس تھی اس نے جی ایم صاحب کا بنگلہ نہیں دیکھا تھا لیکن اسے اندازہ تھا ویسے بھی شادی بیاہ اور ماتم والا گھر تلاش کرنا مشکل نہیں ہوتا۔

ایک جگہ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ یقیناً یہ جی ایم صاحب کا بنگلہ تھا ـــــ بنگلے کے باہر کاریں اور جیپیں اس طرح کھڑی تھیں جیسے میلہ مویشیاں میں لاتعداد مویشی کھڑے ہوں چند ایک کاروں کو پہچان کر اُسے اطمینان ہو گیا کہ وہ وقت سے پہلے نہیں آ گیا۔

گیٹ سے اندر بہت بڑا لان تھا جس میں خوب صورت شامیانے لگے تھے اور نہایت عمدہ قسم کی کرسیاں بچھی تھیں مگر زیادہ تر لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے اِدھر اُدھر کھڑے باتیں کر رہے تھے وہ جس طرف سے گزرتا سلام کے لئے اس کا ہاتھ خود بخود اٹھ جاتا لوگ اُسے چونک کر دیکھتے یا شاید اسے ایسا ہی محسوس ہوتا جیسے اس کا سلام کرنا ناگوار گزرا ہو۔ اُسے فکر دامن گیر تھی کہ وہ جی ایم صاحب سے اظہار تعزیت کیسے کرے گا یوں اس نے احتیاطاً جملے سوچ رکھے تھے۔

"اللہ کا حکم سر"

"رب کی رضا سر"

"صبر کریں سر"

لیکن اُسے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ یہاں رسمی اظہار افسوس کی ضرورت تھی نہ گنجائش۔ جو آتا تھا خاموشی سے بیٹھ جاتا تھا یا دوسروں سے محوِ گفتگو ہو جاتا تھا۔ اس نے دیکھا جی ایم صاحب بہت مصروف تھے کبھی اندر جاتے کبھی باہر آتے تھے۔ اُسے ان کے قریب جانے کی ہمت نہ ہوئی تاہم وہ ایسی جگہ کرسی رکھ کر بیٹھ گیا جہاں سے آتے جاتے ان کی نظر اس پر پڑ سکتی تھی۔

پھر اس کی نظر اپنے سینئر افسر پر پڑی پھر اس سے سینئر افسر پر۔ اُسے لگا جیسے وہ اس کی جرأت پر حیران ہوں اور اندر ہی اندر غصّے میں کھولتے اس کی جواب طلبی کی ڈکٹیشن دے رہے ہوں۔

وہ بہت ہی مرعوب کر دینے والی اور دل و دماغ کو شل کر دینے والی نظروں سے بچنا چاہتا تھا لیکن کہیں جائے امان نہ تھی اور اگر کہیں تھی تو جی ایم صاحب کی نظروں سے اوجھل ہو جانے کا احتمال تھا۔ اس نے پریشان ہو کر نظریں جھکا لیں اور اپنے سامنے اور آس پاس چلتے پھرتے لوگوں کے جوتوں اور ایڑیوں پر نظریں گاڑ دیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا قد سکڑ کر بالشت بھر رہ گیا ہے یا لان میں موجود لوگ اچانک دیو قامت ہو گئے ہیں۔ وہ چاروں طرف سے بہت سے بڑے بڑے لوگوں اور ۱۹ ایس۔ ۲۰ ایس۔ ۲۱ ایس اور ۲۲ ایس گریڈ والے افسروں میں گھرا ہوا تھا۔ یہ آئی جی ہے وہ ایم ڈی ہے یہ سی اے ہے وہ ڈی جی ہے۔ اُسے یہ دیکھ کر ندامت ہوئی کہ اس کے آس پاس بڑے بڑے لوگ کھڑے تھے اور وہ مزے سے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اپنی عقل پر اس کا ماتم کرنے کو جی چاہا۔ وہ کرسی چھوڑ کر ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا مگر ٹہلتے اور باتیں کرتے ہوئے لوگ خود بخود اس کے قریب آ جاتے۔ پھر اسے چونک کر دیکھتے جیسے اتنے چھوٹے قد کا آدمی انہوں نے پہلی بار دیکھا ہو۔

کاش وہ اپنے کسی کولیگ کو ساتھ لے آیا ہوتا ________ اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں کہ شاید اسے کوئی اپنے قد کا آدمی مِل جائے مگر وہاں سب نوگزے تھے۔ اس کا دل ڈوبنے سا لگا کہیں اس نے یہاں آ کر غلطی تو نہیں کی۔ اگر جی۔ ایم صاحب اسے دیکھ لیں ________ ایک بھرپور نظر ________ نہ بھولنے والی ________ تو وہ چپکے سے اُٹھ کر واپس چلا جائے۔

تھوڑی دیر میں اور بہت سے لوگ آ گئے۔

گیٹ کے باہر کاروں کی تعداد اور بڑھ گئی۔ لان میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی اُسی لمحے کچھ لوگوں کو ڈرائنگ روم میں جانے کی دعوت دی گئی وہ اندر جانے والوں میں شامل ہو گیا وہ زیادہ نظروں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُسے صرف جی ایم صاحب کی ایک بھرپور نظر کا انتظار تھا۔ ڈرائنگ روم میں گنتی کے

چند لوگوں میں اس کے امکانات قوی تر تھے۔

سجا سجایا ڈرائنگ روم اس کے دو کمروں کے کواٹر سے زیادہ کشادہ اور نہایت خوبصورت تھا کھڑکیوں کے بیش قیمت اور نفیس پردے، خوشنما قالین اور عالیشان صوفے دیکھ کر اندر داخل ہوتے ہوئے اُسے جھجک محسوس ہونے لگی۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی شاید بیٹھنے کے لئے معمولی قسم کی کرسی، اسٹول یا مونڈھا مل جائے مگر اسے گدّے دار صوفے میں بیٹھنا پڑا۔ تھری سیٹر صوفے میں اس سمیت چار آدمی بیٹھے تھے شائد اس نے کچھ بھی جگہ نہیں گھیر رکھی تھی۔

اس نے دیکھا کارنس پر بڑی بڑی خوبصورت ٹرافیاں، میڈل اور سجاوٹ کی چیزیں پڑی تھیں۔ دروازے کے سامنے باریک تاروں میں پروئی ہوئی مچھلیاں معلّق تھیں۔ ہوا کے جھونکوں سے بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کے پیچھے لپکتی تھیں۔ اُسے لگا کہ تیرتے تیرتے اس کے پَر اور گلپھڑے تھک گئے ہیں اور اپنا بڑا سا مُنہ کھولے شارک اس کے پیچھے لپکتی چلی آرہی ہے لیکن پھر اسے یہ جان کر اطمینان ہوگیا کہ بڑی اور چھوٹی مچھلیوں کے درمیان فاصلہ کم نہیں ہوتا تھا اور وہ آپس میں ٹکراتی نہیں تھیں۔ اسی لمحے ساتھ والے کمرے سے کسی نے ڈرائنگ روم میں جھانکا ــــــــ!

اس کا دل اُچھل کر حلق میں آگیا۔

وہ تعظیماً کھڑا ہوجانا چاہتا تھا کہ وہ پردے کے پیچھے چلی گئی مگر پردے کے نیچے سے دیر تک اس کے سفید اور اُجلے پاؤں نظر آتے رہے۔ اس نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے اپنے پاؤں پیچھے ہٹالئے اسے پہلی مرتبہ پتہ چلا تھا کہ اس کے پاؤں اس قدر مٹیالے اور بھدّے تھے۔

پھر اس کی نظر وال کلاک پر پڑی۔ اتنا بڑا، خوبصورت اور انوکھے ڈیزائن کا کلاک اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا کیا پتہ وہ ماسٹر کلاک ہو۔ اس نے سُنا تھا کہ مختلف کمروں میں لگے ہوئے کلاک ماسٹر کلاک سے کنٹرول ہوتے ہیں سب کے الارم ایک ساتھ بجتے ہیں اور سب کی سوئیاں ماسٹر کلاک کے تابع ہوتی ہیں اس نے یہ بھی سُنا تھا کہ ماسٹر کلاک پر وقت عموماً درست ہوتا ہے لیکن اگر کبھی وقت ماسٹر کلاک سے آگے نکل جاتا یا پیچھے رہ جاتا ہے تو ماتحت کلاک بھی غلط وقت بتانے لگتے ہیں۔

اچانک جی ایم صاحب اندر آ گئے اور اس کی طرف دیکھے بغیر ہوا کے جھونکے کی طرح دوسرے دروازے سے باہر نکل گئے۔

اس نے دیکھا

شام ہونے کو تھی ــــــ پہاڑی لڑکی اپنی بھیڑوں کو ہانکتی ہوئی گھر جا رہی تھی اس کے ہاتھ میں زیتون کی شاخ تھی اور اس کے ہمراہ اس کے وفادار کتّے ــــــ چاروں طرف سبزہ تھا تھوڑے فاصلے پر گھنا جنگل، عقب میں نیلی نیلی پہاڑیاں۔ اُسے خیال آیا اگر کوئی بھیڑیا یا چیتا حملہ کر دے تو؟

اس نے پہاڑی لڑکی سے پوچھا۔

"تمہیں ڈر نہیں لگتا؟"

"لگتا ہے"۔ وہ بولی" لیکن پہلے مجھے ڈر نہیں لگتا تھا۔ میرے کتّے شیر سے زیادہ بہادر، چیتے سے زیادہ پھرتیلے اور بھیڑیئے سے زیادہ خونخوار تھے میرا بھائی قریب ہی جنگل میں لکڑیاں کاٹتا تھا اس کے کلہاڑے کی دھمک سے جنگل گونجتا تھا اور اس کی للکار سُن کر جانور سہم جاتے اور پرندے پھڑ پھڑا کر درختوں سے اڑ جاتے تھے لیکن پھر میں اپنی بھیڑوں، وفادار کتّوں اور نیلی پہاڑیوں سمیت تصویر میں قید ہو گئی۔ اب میری بھیڑیں خاموش ہیں کتّے ساکت اور بھائی کے کُلہاڑے کی آواز سُنائی نہیں دیتی۔

اس نے چونک کر دیکھا سب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر اطمینان سے بیٹھے تھے مگر وہ کھڑا تھا جی ایم صاحب کے کمرے میں آنے اور لوٹ جانے کے بعد وہ اب تک کھڑا تھا۔ کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔ وہ جلدی سے پھر صوفہ میں دھنس گیا۔

میّت کو لان میں لایا گیا تو سب لوگ باہر آ گئے اور نماز جنازہ کے لئے صفیں بنانے لگے ـــ اس نے بہت کوشش کی کہ وہ اس ہجوم میں جی ایم صاحب کو ڈھونڈ نکالے اور نماز جنازہ پڑھتے ہوئے ان کے قریب کھڑا ہو مگر وہ اسے نہ مل سکے۔ بار بار اپنے دوسرے سینئر افسران سے اس کا سامنا ہوجاتا۔

دُعا کے بعد وہ لپک کر آگے بڑھا اور جنازے کو کندھا دینے والوں میں شامل ہو گیا۔ دو ایک بار جی ایم صاحب قریب آئے مگر انہوں نے اُسے نہیں دیکھا۔

بہت سے لوگ نمازِ جنازہ پڑھ کر رُخصت ہو گئے تھے اس کا خیال تھا اب تھوڑے لوگوں میں وہ اُسے مزید دیکھ لیں گے اور یاد بھی رکھ سکیں گے لیکن وہ دوسری جانب کندھا دے کر پیچھے ہٹ گئے اور سر جھکا کر جنازے کے پیچھے چلنے لگے۔

چند ایک بار اس کی جگہ بدل گئی مگر وہ پھر اس خیال سے اپنی جگہ پر واپس آجاتا کہ شاید وہ اس کی جگہ لینے آئیں تو ان سے آنکھیں چار ہو جائیں۔ لیکن ڈیڑھ دو میل چلنے کے بعد بھی انہوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی تو اس کا دل بیٹھنے لگا۔

قبرستان پہنچتے پہنچتے شام کا اندھیرا ہر طرف پھیل گیا اور کچھ فاصلے سے ایک دوسرے کو پہچاننا مشکل ہو گیا۔

دفتر سے نکلے اب اُسے تقریباً پانچ گھنٹے ہو چلے تھے اسے اپنے پانچ گھنٹے ضائع ہوتے نظر آ رہے تھے تاہم اس نے ہمّت نہیں ہاری اور میّت کو لحد میں اتارتے، مٹی ڈالتے اور گلاب کا عطر چھڑکتے وقت بھی وہ پیش پیش رہا اور مسلسل دیکھتا رہا کہ وہ اسے دیکھتے ہیں یا نہیں۔

اس کے دوسرے سینئر افسران میں سے بہت سے اب بھی موجود تھے اور مسلسل اس کی کارکردگی کا نوٹس لے رہے تھے مگر انہوں نے درخواست فارورڈ (FORWARD) کرنا تھی آخری فیصلہ جی ایم صاحب کے ہاتھ میں تھا اور وہ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے۔

پھر قبرستان کے باہر کاروں کی قطار لگ گئی ان میں شاید جی ایم صاحب کی ایئر کنڈیشنڈ کار بھی تھی۔

دُعا کے بعد جی ایم صاحب بلند قامت لوگوں کے ہمراہ کار کی طرف چلے گئے اور وہ گم صُم قبر پر کھڑا رہ گیا۔

لیکن پھر ایک شخص جو گورکنوں کو پیسے دے رہا تھا اس کی طرف آیا اور اس کے ہاتھ پر پانچ روپے کا نوٹ رکھ دیا۔

اس کا جی چاہا وہ پھپھک پھپھک کر رونے لگے لیکن پھر اسے خیال آیا کہ اگر وہ دفتر میں اوور ٹائم کام کرتا تو بھی اتنے ہی پیسے بنتے اُس نے پانچ روپے کا نوٹ جیب میں ڈالا اور ایک طرف چل دیا۔

۲(ا+ب)

"کئی روز سے سخت بیمار ہوں، بچنے کی امید کم ہے، مرنے سے پہلے کہا سُنا معاف کرانا چاہتی ہوں، خدا کے واسطے مایوس نہ کرنا تھوڑی دیر کے لئے چلے آنا تاکہ میں سکون سے مر سکوں۔"

فرزانہ میرے ہاتھ سے خط چھین لیتی ہے اور پڑھ کر تیز لہجے میں پوچھتی ہے

"یہ جنت کون ہے؟"

"یہ وہی جنت ہے" میں جھوٹ نہیں بولنا چاہتا "جس نے مجھے آٹھویں جماعت کے وظیفے کے امتحان میں فیل کرایا تھا اور سارے گاؤں اور برادری میں بدنام کیا تھا۔"

فرزانہ کو چُپ لگ جاتی ہے۔

مجھے اس کی چُپ سے ہول آنے لگتا ہے میرے اندر کوئی دانت پیسنے اور بلند آواز میں ننگی گالیاں بکنے لگتا ہے ــــــــ

فرزانہ مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتی اور کہیں دور سے بولتی محسوس ہوتی ہے

"اچھا تو یہ وہی ہے!"

"ہاں وہی کمینی جنت ــــــ حرام ......" مجھے غصہ آرہا ہے۔

"ایسا نہ کہیئے" فرزانہ میری بات کاٹ کر کہتی ہے "اس کا آخری وقت ہے۔"

"آخری وقت ہے تو میں کیا کروں" میں پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل جاتا ہوں۔

رات کو جب میں فلم دیکھ کر گھر لوٹتا ہوں فرزانہ میرے لئے کھانا نکالتے ہوئے کہتی ہے: "آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں:

"کہو۔"

"آپ جنّت کو دیکھنے گاؤں چلے جائیں۔"

"کیوں؟ میں چڑ کر کہتا ہوں "تمہیں کس بات کا شک ہے۔"

"شک نہیں۔" وہ کہتی ہے "بیماری کا آخری وقت ہے اور پھر ممکن ہے وہ آپ کو اصل بات بتانا چاہتی ہو ــــــ آپ کی ایک بڑی اُلجھن دُور ہو جائے گی اور آپ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کریں گے۔"

"اصل بات؟ ہاں ــــــ اگر وہ مجھے اصل بات بتا دے تو میں اُسے اب بھی معاف کر سکتا ہوں۔"

"مجھے یقین ہے وہ ضرور سچ سچ بتا دے گی آپ جا کر تو دیکھیں۔"

فرزانہ کے اصرار اور اس اُمید پر کہ شاید جنت مجھے اصل بات بتا ہی دے میں ہفتے کے روز گاؤں جانے کے لئے رضامند ہو جاتا ہوں۔

رات کو سونے کے لئے لیٹتا ہوں تو سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے موتیے کے تازہ پھولوں کی خوشبو اندر آتی ہے پھر ایک سایہ سا کھڑکی کے فرش پر کودتا ہے اور پردوں کے پیچھے غائب ہو جاتا ہے میں فرزانہ کو آواز دیتا ہوں وہ میرے پہلو میں لیٹی ہے لیکن اسے میری آواز سنائی نہیں دیتی ــــــ کچھ عرصہ سے میرے اور اس کے درمیان اجنبیّت کی نظر نہ آنے والی دیوار خود بخود کھڑی ہو گئی ہے ــــــ اسی لمحے گاؤں کی ساری عورتیں ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں اور مجھے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں وہ مجھے مسکرا مسکرا کر حیرت سے دیکھتی اور آپس میں سرگوشیاں کرتی ہیں پھر مجوب سی مسکراہٹ دباتے ہوئے باری باری مجھ سے پوچھتی ہیں۔

"منڈیا ــــــ تیری عُمر کیہہ اے؟"

"وے توں کنے سالاں دا ایں؟"

مجھے پتہ نہیں چلتا انہیں میری عُمر کی فکر کیوں لاحق ہو گئی ہے لیکن پھر ماتھے پر تیوریوں کے بل ڈالے صاف

آگے بڑھتی ہے اور کہتی ہے ۔

"فیل نہ ہوتا تو کیا کرتا ـــــــ موت جو گے نے اور گُل جو کھِلایا"

مجھے یاد ہے کہ میں آٹھویں جماعت کے وظیفے کے امتحان سے فیل ہو گیا ہوں لیکن مجھے بالکل یاد نہیں کہ میں نے کیا، کب اور کیسا گُل کھلایا ہے ۔میں نے گُل ضرور کھلایا ہو گا ـــــــ لیکن میں نے اُسے کِھلتے ہوئے نہیں دیکھا ۔

ماسی بختاں کہتی ہے "مجبوری والیا ـــــــ وہ تو مشکل سے بچی ہے "

"کون ؟"

"بڑا بےشرم ہے ـــــــ پوچھتا ہے کون ؟"

ماسی بختاں ہنس کر چلی جاتی ہے ۔

میں نے وظیفے کا امتحان پاس نہیں کیا لیکن میں نے آٹھ جماعتیں پڑھی ہیں ساری بات میری سمجھ میں آجاتی ہے مجھے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ جنت دو دن سے گھر سے باہر کیوں رہی ہے اور جب لوٹ کر آئی ہے تو اس قدر کمزور اور پیلی نظر کیوں آتی ہے ۔

لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس کا مجھ سے کیا تعلق ؟ ـــــــ لیکن سنا ہے کچھ لوگوں کو نیند میں چلنے کی بیماری ہوتی ہے کیا پتہ مجھے بھی ہو ؟ میں ماموں کے ہاں پڑھنے اور وظیفے کا امتحان پاس کرنے آیا تھا ۔کہتے تھے یہاں پڑھائی اچھی ہے اور پھر ماموں خود سکول ماسٹر تھے ابا کے پاس شاید اپنا سر فخر سے بلند کرنے کے لئے کوئی اور ذریعہ نہیں تھا اس لئے ان کا خیال تھا کہ میرا وظیفہ آگیا تو برادری میں ان کا سر فخر سے بلند ہو جائے گا ۔

ماموں کے گھر کے بڑے پسار کے پیچھے دو کوٹھڑیاں تھیں ۔ دائیں جانب والی کوٹھڑی میں ممانی اپنی بیٹیوں کے ساتھ اور بائیں جانب والی کوٹھڑی میں ماموں اپنے حقّے سمیت سوتے تھے ۔

پسار کی دائیں جانب میری اور بائیں جانب جنت کی چارپائی ہوتی تھی ۔جنت ماموں کی بھتیجی تھی جو اسی گھر میں پل کر جوان ہوئی تھی ۔میری اس کی بے تکلفی نہیں تھی ۔ صرف ایک بار میری آنکھ

پہنچ جانے پر اس نے میری آنکھ میں پھونک مارنا چاہی تو غلطی سے پھونک میرے منہ میں چلی گئی تھی۔

میرے اور جنت کے درمیان بھائیں بھائیں کرتا پسار ——— پسار کی دیواروں پر لگی پڑچھتیاں ——— پڑچھتیوں میں قطار اندر قطار رکھے چینی اور شیشے کے برتن اور دھات کے گلاس ——— دیوار سے لگی مٹیاں ——— چونکیاں ——— لاٹوؤں والی الماریاں اور پرندوں کی تصویروں والا چارٹ ——— یا پھر مٹی کے تیل کا دیا جس کی روشنی جنت کی چارپائی تک جاتے جاتے بینائی سے محروم ہو جاتی تھی۔

ممانی کی کوٹھڑی سے اس کی بیٹیوں کے نیند میں بڑبڑانے کی آوازیں آتی رہتیں۔

"نی شیدو ——— تینوں سپ لڑے۔"

"بے بے ——— تھوڑا جیہا گُڑ دے۔"

"ہائے ہائے نی مینوں کھا گئی۔"

ممانی بار بار انہیں ڈانٹتی پھٹکارتی اور پہلو بدل کر سونے کی ہدایت دے کر خود بھی بڑبڑاتی ہوئی سو جاتی۔

ماموں کے کمرے سے باری باری حقہ گڑگڑانے اور کھانسنے کی آوازیں آتی رہتیں۔

گرمیوں میں دیہات کے لوگ تہمد کو اچھی طرح باندھ کر سوتے مگر سردیوں میں لحافوں کی وجہ سے اس احتیاط کی ضرورت نہ ہوتی۔ مگر کھڑکیاں دروازے بند ہوں تو خواہ باہر کتنی ہی سردی پڑ رہی ہو کچی دیواروں والے مکان گرم رہتے ہیں۔ جنت بھی لحاف میں منہ سر ڈھانپ کر سوتی لیکن جب پڑوسیوں کا مرغ آدھی رات کو دسمی ویلا سمجھ کر اذانیں دینے لگتا تو جنت کو گرمی لگتی اور وہ پاؤں مار مار کر لحاف ایک طرف گرا دیتی۔

مٹی کے تیل کے دیئے کی مدھم سی لو اچانک لٹ لٹ کرنے لگتی اور سارے پسار میں روشنی پھیل جاتی۔

دیوار سے لٹکتے ہوئے پرندوں کے چارٹ کا کالا تیتر زور زور سے بولنے لگتا۔

میری پسلی سے ٹیر ٹیر کرتی ٹٹہری نکلتی اور سارے پسار کا چکر لگا کر پڑچھتی پر جا بیٹھتی۔

مجھے وظیفے کے امتحان کا خیال آتا اور میں کتابوں کی ورق گردانی کرنے لگتا۔ تاجر خواہ کتنی ہی سستی

جنس خریدتا اور کتنی ہی مہنگی فروخت کرتا اسے نفع کی بجائے اُلٹا نقصان ہوتا۔

نادر شاہ کی فوجیں دلّی پر چڑھائی کرتیں اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتیں ـــــ یہ ساری اینٹیں ایک ایک کر کے رات بھر میرے سَر میں لگتی رہتیں۔

طولِ بلد اور عرضِ بلد آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے اور خطِ استوا خطِ سرطان کے سینے پر چڑھ بیٹھتا۔

الف اور ب اپنے اپنے مُربعے سَروں پر اٹھاتے پسار کے کچے فرش پر بھنگڑہ ڈالتے اور زاویہ یا قوس کی تنصیف کرتے ہوئے پرکار کی سوئی میری انگلی میں اُتر جاتی پھر ایک رات میں نے پہلی بار آتش بازی کا خواب دیکھا۔ شوں شوں کرتی ہوائیاں اُوپر جاتیں اور آگ کے پھولوں کا باغ سا کھِل جاتا۔

پھر ایک ہوائی جس کے سر پر گولا سا بندھا ہوا تھا شوں شوں کرتی اُوپر ہی اُوپر چڑھتی گئی پھر کہیں بہت دُور سے پہلے آسمان سے آواز سُنائی دیتی ٹھاہ ـــــ ٹھاہ !

میں ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ آنکھ کھُلی تو میرا لباس پسینے میں تر تھا جسم سیاہ ہو چکا تھا اور سارے پسار میں بارُود کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔

ہفتے کے روز میں گاؤں جانے کے لئے دفتر سے جلدی آ جاتا ہوں لیکن یہ دیکھ کر کہ فرزانہ کو میرے جانے کی کچھ فکر نہیں پوچھتا ہوں کیا بات ہے ؟

جواب میں وہ میرے سامنے ابّا کا خط رکھ دیتی ہے۔ ابّا نے اور باتوں کے علاوہ یہ اطلاع بھی دی ہے کہ میاں الہ بخش کی زوجہ جنت بی بی رضائے الٰہی سے فوت ہو گئی ہے۔

پے انگ گیسٹ

وہ اس گھر میں اتنے عرصے سے پے اِنگ گیسٹ کے طور پر رہ رہا ہے کہ اب وہ اسی کو اپنا گھر سمجھنے لگا ہے۔

وہ بھی اسے اپنے گھر کا فرد ہی سمجھتے ہیں۔

اڑوس پڑوس میں اکثر نئے لوگ آگئے ہیں۔ ویسے بھی کسی کو یہ معلوم کرنے کی فرصت نہیں کہ اس گھر میں وہ کس حیثیت سے رہتا ہے۔ عام لوگ اسے گھر کا مالک ہی سمجھتے ہیں۔ وہ خود بھی اکثر بھول جاتا ہے کہ وہ گھر کا مالک ہے یا پے اِنگ گیسٹ۔ ویسے بھی لینڈ لیڈی بیگم حمید اور اس کی بیٹیوں کو اس نے کبھی غیر نہیں سمجھا اور نہ ہی کبھی حساب کتاب کے جھنجھٹوں میں پڑا ہے۔ اسے معقول تنخواہ ملتی ہے اور وہ جو کچھ کماتا ہے، ان کے حوالے کر دیتا ہے اس کے بدلے میں وہ اس کی ہر طرح سے خدمت کرتے۔ اس کے آرام و آسائش کا خیال رکھتے اور اس کی بے حد عزت کرتے ہیں اور ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ اسے اجنبیت کا احساس نہ ہونے دیں لیکن وہ کچھ عرصے سے خود کو ہوم سک محسوس کر رہا ہے اور اس گھر سے اس کا دل اُچاٹ ہوتا جا رہا ہے۔

اس کے مصرف میں کوٹھی کا بہترین حصہ ہے۔ دفتر سے واپسی پر کار کا ہارن سنتے ہی ملازم بیگ تھامنے کے لئے حاضر ہوتا ہے۔ فرصت ہو تو بیگم حمید ڈرائنگ روم کے دروازے پر آکر مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتی ہیں۔ بیگم حمید کی جوان بیٹیاں دوپٹے ٹھیک کرتی ہوئی باری باری آکر اسے سلام کرتی ہیں

مگر سلام کرتے ہی یوں اُلٹے پاؤں جلدی جلدی لوٹ جاتی ہیں جیسے آدمی فقیر کے سامنے سکہ پھینک کر آگے بڑھ جاتا ہے ۔ بس ایسی ہی باتوں سے کبھی کبھی اس کا دل اُداس ہو جاتا ہے اور اسے اپنا گھر یاد آنے لگتا ہے ۔

بیگم حمید کی مسکراہٹ اور اس کی بیٹیوں کے سلام وصول کر کے وہ اپنے کمرے میں پہنچتا ہے تو میز پر کھانا چُنا ہوتا ہے ۔ شروع شروع میں جب وہ پرہیزی کھانا نہیں کھاتا تھا اسے کھانے کے لئے ڈائننگ رُوم میں بُلا لیا جاتا تھا مگر اب کھانا اس کے کمرے میں بھیج دیا جاتا ہے حالانکہ اس کا جی چاہتا ہے وہ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائے ۔ کھانے کے ساتھ گپ شپ ہوتی ہے اور وہ ماں بیٹیاں اس سے ایسی باتیں کریں جس سے دفتر کے کام کی بوریت اور تھکن دُور ہو جائے ۔ مگر وہ سب اس کا اس قدر احترام کرتی ہیں کہ اس کی موجودگی میں بلند آواز سے بات بھی نہیں کرتیں ۔ اس کے گھر میں داخل ہونے کے بعد ریڈیو کی آواز دھیمی کر دی جاتی ہے ۔ وہ ایک دوسری سے سرگوشیوں میں باتیں کرتی ہیں اور دروازے کھولنے اور بند کرنے میں بھی اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ زیادہ شور نہ ہو ۔

وہ کھانا کھا کر اپنے کمرے میں لیٹتا ہے تو اسے لگتا ہے جیسے وہ سجے سجائے بیڈ رُوم میں نہیں ویران قبرستان میں لیٹا ہوا ہے ۔ شام کو وہ کمرے کی قید سے رہائی پا کر ٹہلتا ہوا کلب چلا جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے بھول جاتا ہے کہ اُداسی کی چلچلاتی دُھوپ نے اس کا بدن جھلسا دیا ہے لیکن جونہی وہ رات کو کلب سے باہر آتا ہے جمائیاں لیتی ہوئی تاریکی اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے کلب کے صدر دروازے کے سامنے اکڑوں بیٹھی ہوئی اکتاہٹ کی خارش زدہ کتیا، اس پر زور زور سے بھونکنے لگتی ہے وہ گھر میں قدم رکھتا ہے تو در و دیوار سے آدم بو آدم بو کی آوازیں آتی ہیں ۔ ہنستے بستے گھر میں چُپ کی صفِ ماتم بچھ جاتی ہے ۔ دوپٹے ٹھیک کئے جاتے ہیں ۔ فرش پر سلاموں کے سکے کھنکتے ہیں اور ٹیلیویژن کا گلا دبا دیا جاتا ہے ۔

رات کے کھانے کے بعد اس کا جی چاہتا ہے وہ سب یا ان میں سے کوئی اس کے پاس آئے اور اس سے باتیں کرے لیکن وہ سب اپنے کمروں میں چھپ جاتی ہیں ۔ وہ کوئی کتاب اُٹھا کر پڑھنے لگتا ہے اُکتا

جاتا ہے تو دوسری کتاب اُٹھا لیتا ہے کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لئے بیگم حمید اس کی خیریت معلوم کرنے آجاتی ہیں لیکن ان کی باتیں اس کے لئے غیر دلچسپ اور بور ہوتی ہیں وہ گھر کے اخراجات، مہنگائی، خریداری، شادیوں اور لڑکیوں کے رشتوں کی باتیں کرتی ہیں پھر خود ہی جمائیاں لیتی ہوئی اُکتا کر چلی جاتی ہیں۔ البتہ جب کبھی اس کی طبیعت اچھی نہیں ہوتی، بیگم حمید کئی کئی بار اس کی مزاج پُرسی کے لئے آتی ہیں۔ ان کی لڑکیاں بھی باری باری آتی ہیں۔ ٹیلیفون کر کے فوراً ڈاکٹر کو بُلا لیا جاتا ہے یا ہسپتال سے ایمبولنس منگائی جاتی ہے۔ ملازم کو سخت تاکید کی جاتی ہے کہ وہ رات بھر اس کے پاس رہے۔ وقت پر دوا پلائے۔ پاؤں دبائے اور ایمرجنسی کی صورت میں بیگم حمید کو جگا کر اطلاع دینے میں تامل نہ کرے۔

بیمار ہو کر اس کے دل میں عجیب سی خواہش جاگتی ہے اس کا جی چاہتا ہے بیگم حمید خود اس کا سر دبائیں۔ آصفہ رفیعہ اور فریدہ پاس رہیں اس سے باتیں کریں اور اپنے ہاتھ سے اسے دوا پلائیں۔ لیکن پھر اسے یاد آجاتا ہے کہ وہ اس گھر میں پے اِنگ گیسٹ ہے۔ اور گھر والوں کو اسکی تیمارداری اور خدمت گذاری کے علاوہ بھی بہت سے کام ہیں ان کی اپنی مصروفیتیں اور دلچسپیاں ہیں۔ بیگم حمید کو خریداریوں اور گھر کے کام کی نگرانی سے فرصت نہیں ملتی۔ پھر آئے دن کوئی نہ کوئی ملازم بیمار ہو جاتا یا چھٹی پر چلا جاتا ہے بڑی لڑکیوں کے رشتے آرہے ہیں اور بیگم حمید مہمانوں کی خاطر تواضع اور جہیز وغیرہ کی اُلجھنوں میں لگی رہتی ہیں۔ آصفہ کو فلموں اور گانوں سے بے حد دلچسپی ہے۔ وہ نئے نئے ریکارڈ اور ٹیپ جمع کرتی اور سُنتی رہتی ہے۔ اُسے پتہ چلا ہے کہ وہ خود بھی اچھا گا لیتی ہے۔ شاید ناچ بھی لیتی ہو کیونکہ اس کا جسم رقص کے لئے بے حد موزوں نظر آتا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے جب اس کا کومل بدن تھرکتا اور لمبی سیاہ زُلفیں رخساروں پر بکھری ہوں اور وہ بند کمرے میں اکیلی ناچ رہی ہو وہ اسے چھُپ کر دیکھے۔ کئی بار وہ اس ارادے سے آصفہ کے کمرے کی طرف بڑھا ہے مگر ہر مرتبہ گھر کے لوگوں اور ملازموں نے اسے یوں گھیر لیا ہے جیسے وہ اسے اغوا کرنے جا رہا ہو۔

منجھلی رفیعہ کو بناؤ سنگار اور فیشن سے گہرا شغف ہے وہ ہر وقت کریموں، پاؤڈروں، رنگوں، خوشبوؤں لباسوں اور اپنی فیشن ایبل سہیلیوں میں گھری رہتی ہے اور اس کا جی چاہتا ہے ہر وقت دُلہن سی نظر آنے والی رفیعہ اس کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لئے جائے اور ہوٹلوں، پارکوں اور سیرگاہوں میں لوگ اسے حسد و رقابت

کی نظروں سے دیکھ دیکھ کر جلیں مگر رفیعہ اس کے سامنے آتی ہے تو نظریں نیچی کئے رکھتی ہے اور اپنے خوبصورت بالوں اور کھلے گلے کی قمیض کا اوپر کا حصہ بار بار دوپٹے سے ڈھانپتی رہتی ہے۔

فریدہ سب سے چھوٹی مگر اپنی عمر سے دوگنا زیادہ جوان ہے۔ اسے دیکھ کر ندامت سے اس کی اپنی گردن جھک جاتی ہے۔ فریدہ کی شکل اس سے بے حد ملتی جلتی ہے اور وہ اس کے اور بیگم حمید کے لئے بدنامی کا نیون سائن معلوم ہوتی ہے۔ گھر میں آنے جانے والے یہ نیون سائن دیکھتے اور پکار اٹھتے ہیں "فریدہ کی شکل ہوبہو آپ پر گئی ہے"۔

فریدہ کو دیکھ کر اسے لگتا ہے جیسے وہ کئی برس چھوٹا ہو گیا ہو اور اس کی جنس تبدیل ہو گئی ہو۔ کئی بار غسلخانے کے آئینے میں اس نے اپنے جسم پر فریدہ کے جسم کے ٹکڑے چپکا کر دیکھے ہیں اور شرم سے پانی پانی ہوا ہے۔ شاید فریدہ بھی غسل خانے میں اپنے جسم کو اسی طرح دیکھتی اور پانی پانی ہوتی ہے کیونکہ وہ اس سے شرمائی شرمائی اور جھینپی جھینپی سی رہتی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے وہ اس سے بے تکلفی سے ملے۔ اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کوئی ایسی فرمائش کرے جسے پورا کرنا اس کے لئے آسان نہ ہو لیکن فریدہ بھی اپنی بہنوں کی طرح اس سے دُور دُور رہتی اور اس کی بے حد عزت کرتی ہے۔

اُسے اس گھر میں جس میں وہ کئی برسوں سے پے اِنگ گیسٹ کے طور پر رہ رہا ہے ہر طرح کا آرام میسّر ہے۔ ٹائم پیس کا الارم اسے بروقت جگا دیتا ہے۔ غسلخانے میں اسے گرم پانی رکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ غسلخانے سے باہر آتا ہے تو استری کئے ہوئے کپڑے اس کے منتظر ہوتے ہیں۔ وہ گھنٹی بجاتا ہے تو ملازم ناشتہ لے کر حاضر ہو جاتا ہے۔ اسے کسی بھی چیز کے لئے کہنا نہیں پڑتا۔ ضرورت کی ہر چیز اسے خود بخود مل جاتی ہے لیکن اس کا دل خوشی سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔ سب اس کا احترام کرتے۔ اس کے آرام کا خیال رکھتے اور اس کی ہر بات بے چوں و چرا مان لیتے ہیں۔ اس کا جی چاہتا ہے کوئی اس سے لڑے جھگڑے۔ اسے گالیاں اور طعنے دے۔ دیر سے گھر آنے پر باز پُرس کرے اور اس سے پوری نہ کی جا سکنے والی فرمائشیں کرے مگر پھر اسے یاد آ جاتا ہے کہ یہ اس کا اپنا گھر نہیں۔ وہ یہاں پے اِنگ گیسٹ ہے۔

رات کو سب اپنے اپنے کمروں میں محوِ خواب ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کمرے میں خود کو تنہا اور اُداس محسوس

کرتا اور کہیں بھاگ جانا چاہتا ہے لیکن اس گھر میں اسے جو آرام میسّر ہے وہ اس کے پاؤں کی زنجیر بن گیا ہے اسے اپنے اردگرد نظر نہ آنے والے مسلح پہریدار کھڑے محسوس ہوتے ہیں لیکن وہ زنجیریں توڑ دینا اور مسلح پہرے داروں کا گھیرا توڑ کر فرار ہو جانا چاہتا ہے۔ اس خوبصورت اور پُرتکلف ماحول میں اس کا دم گھٹ رہا ہے وہ کھُلی فضا میں سانس لینا چاہتا ہے۔

پھر ایک روز بیگم حمید کے ہاں بہت سے مہمان آتے ہیں۔ رات دیر تک دروازے کھُلنے اور بند ہونے اور موٹروں کے انجن سٹارٹ ہونے کی آوازیں سنائی دیتی رہتی ہیں۔ وہ اُٹھ کر صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہتا ہے کہ دستک دیئے بغیر بیگم حمید اس کے کمرے میں گھُس آتی ہیں۔ شاید وہ کسی سے لڑکر آرہی ہیں۔ وہ آتے ہی غصّے میں لتھڑی ہوئی آواز سے اس پر حملہ کرتی ہیں "شادی کی ڈیٹ بھی فکس ہوگئی مگر آپ کو کچھ فکر نہیں۔"

شادی! ـــــــــ کس کی شادی؟ وہ گھبرا کر پوچھتا ہے۔

بیگم حمید کو اور غصّہ آجاتا ہے۔ وہ کہتی ہیں "حمید صاحب! ـــــ آپ تو اس گھر میں مہمان آئے لگتے ہیں۔"

"صرف مہمان نہیں" وہ تصحیح کرتا ہے "میں پے اِنگ گیسٹ ہوں۔"

بانجھ ہوا میں سانس

گھُپ اندھیری رات ۔ ہَوا بند ــــ اندر باہر دم گھونٹنے والا حبس ۔ اوپر گرد آلُود آسمان اور بجھتے ہوئے تارے ۔ نیچے ہانپتے ہوئے بیل کے سینگوں پر ڈولتی زمین!

اندر مچھرّوں کی گھوکر ۔ باہر آسمان کی طرف منہ اٹھاکر روتے کتوّں اور آپس میں لڑتی بلیوّں کی آوازیں ۔ گھر کا اکلوتا کمرہ ۔ جس کا دروازہ گلی میں کھلتا ہے ۔ ہوا بھول کر اندر آجائے تو اُسے باہر جانے کا راستہ نہ ملے ــــ وہ پسینے میں شرابوُر ــــ ننگی چارپائی پر لیٹا ہے ۔ اور جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو یا اس کے منہ اور نتھنوں میں روئی ٹھونس دی گئی ہو، اس کا دم گھٹنے لگتا ہے ۔ وہ آسمان کی طرف منہ اٹھاکر روتے کتوُّں یا آپس میں خوفناک غرّاہٹوں سے لڑتی بلیوّں یا پھر اپنے ہی گلے سے نکلنے والی عجیب وغریب آوازوں کو سُن کر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا اور کھنکار کھنکار کر سانس لینے کے عضلات صاف کرتا ہے ۔ اس کا سانس پھُولا ہوا ہے اور وہ یوُں ہانپ رہا ہے جیسے سو کر نہیں اٹھا میلوں لمبی دوڑ لگا کر آیا ہے ۔ وہ ہانپتا ہوا اٹھ کر دروازے تک آتا ہے اور سنسان گلی میں کھڑے ہو کر چھت پر سوئے ہوئے بیوی بچوّں کو مدد کے لئے پکارتا ہے مگر اسے کوئی جواب نہیں ملتا ۔ وہ چھت پر جانا چاہتا ہے مگر چھت پر جانے کے لئے کوئی سیڑھی نہیں ہے اس کی بیوی اور بچےّ بغل والی حویلی کی طرف سے اپنے گھر کی چھت پر جاتے ہیں اور چونکہ بڑی حویلی کی عورتوں کی بے پردگی کا احتمال ہے اس لئے اُسے اوپر جانے کی اجازت نہیں ہے ۔

وہ دوبارہ گرد آلود آسمان کی طرف منہ اٹھا کر بیوی کو آواز دیتا ہے اپنی آواز اُسے عجیب وغریب معلوم ہوتی ہے بالکل ایسی ہی جیسی آوازیں سن کر وہ جاگا ہے۔ اُسے اب بھی کوئی جواب نہیں ملتا۔ وہ تھک ہار کر گلی کے کچے فرش پر اکڑوں بیٹھ جاتا ہے۔ اُسے خود حیرانی ہوتی ہے کہ وہ اس طرح بیٹھنے پر کیوں مجبور ہے وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اوپر منہ کرکے آوازیں دیتا رہتا ہے۔ پھر پھٹے پرانے کاغذ کا ایک ٹکڑا اُڑتا ہوا اس کے قریب سے گزرتا ہے تو اسے یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ ہوا بند نہیں ہے۔

ہوا بند نہیں ہے لیکن یہ کیسی بانجھ ہوا ہے کہ جس میں اس کا دم گھٹا جا رہا ہے۔ شاید دھوپ میں مسلسل کام کرنے اور شدید گرمی اور حبس میں اندر سونے کی وجہ سے حبس نے اس کے اندر جگہ جگہ بِل کھود لئے ہیں۔ کیا پتہ اُسے سانس کی تکلیف ہو گئی ہو آخری عمر میں آبا کو بھی دمہ ہو گیا تھا رات بھر وہ اسی طرح سینے کی چاٹی میں سانس کی مدھانی ڈالے رڑکتا رہتا تھا مگر اسی لمحے ایک مریل سا کتا ہانپتا ہوا اس کے قریب آتا ہے اور اس کے پاؤں چاٹنے لگتا ہے شاید اُسے بھی دمہ ہو گیا ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے سامنے اکڑوں بیٹھ جاتے ہیں اور جلدی جلدی سانس لینے لگتے ہیں پھر اُسے چھت سے سوئی ہوئی بیوی اور بچوں کی خوفناک آوازیں سنائی دیتی ہیں جیسے کوئی ان کے گلوں پر چھری چلا رہا ہو۔ وہ پریشان ہو کر انہیں پھر آواز دیتا ہے مگر گھٹی ہوئی چیخوں اور کراہوں کے سوا کچھ جواب نہیں ملتا تو کیا ان سب کو دمہ ہو گیا ہے؟ وہ اور کتا اٹھ کر گلی کا چکر لگاتے ہیں۔ ہوا چل رہی ہے۔

مگر حبس سے دم گھٹا جاتا ہے۔ پتہ نہیں ہوا کو کیا ہو گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ساری ہوا باسی ہو گئی ہے اور خود تازہ جھونکوں کی تلاش میں ادھر اُدھر ٹامک ٹوئیے مارتی پھرتی ہے۔ منڈیروں کو چھو کر گزرتے ہوئے اس کی کراہیں نکلتی ہیں اور ممیاہٹیں سنائی دیتی ہیں۔

اچانک اُسے یاد آتا ہے کہ آج مہینے کی وہی تاریخ ہے جس کے بارے میں وہ کئی دنوں سے

مختلف افواہیں سن رہا تھا۔ کہتے تھے نئے مہینے کی پہلی تاریخ سے ہوا بدل جائے گی اور اس میں جانداروں
کو سانس لینا دشوار ہو جائے گا اس نے شیخوں کی ہٹی، چوپال اور مسجد میں ہر جگہ یہ باتیں سُنی تھیں
نمبردار اور چودھریوں کے ہاں ہوا سے بھرے ہوئے بالکل ویسے ہی سلنڈر دیکھے تھے جیسے
ہسپتالوں میں ہوتے ہیں ان میں سانس لینے کے لئے نلکیاں لگی ہوئی تھیں اسے یاد پڑتا ہے
شاید اس ہوا کو آکسیجن کہتے تھے۔ گاموں ترخان کے لڑکے نے جو شہر میں پڑھتا تھا اُسے بتایا تھا کہ
ہوا سے بہت سی گیس نکال لی جائے گی اور اسے سلنڈروں میں بھر کر ڈپوؤں پر فروخت کیا
جائے گا اور ہر شخص کو زندہ رہنے کے لئے ہوا سے بھرے ہوئے سلنڈر ہر وقت ساتھ رکھنا ہوں گے مگر
اسے ان باتوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ پہلے کبھی ایسا ہوا ہے؟ اور بھلا اتنی ساری ہوا سے گیس کیسے نکالی
جا سکتی تھی لوگ کندھوں پر گیس کے سلنڈر اٹھائے کام کاج کیسے کر سکتے تھے مگر اب اسے محسوس ہو رہا ہے
کہ وہ شاید ٹھیک ہی کہتے تھے یقیناً ہوا میں سے کوئی چیز نکال لی گئی ہے اور جیسے عورت سے حیا،
اور مرد سے غیرت نکال لی جائے تو گوشت کے سوا کچھ نہیں بچتا ہوا کا بھی بھوک باقی رہ گیا ہے جس
میں اب بستی کے اور بہت سے بچوں، عورتوں اور مردوں کی بلبلاہٹیں اور گھٹی ہوئی چیخیں جیسے انہیں
کُند چھریوں سے ذبح کیا جا رہا ہو شامل ہو گئی ہیں۔ بستی کے گھروں کے دروازے کھلنے اور بند ہونے
کی آوازیں اور پھاٹکوں کی چرمراہٹیں سنائی دیتی ہیں چھوٹے گھروں کے مکین گلیوں میں ننگ دھڑنگ
دوڑتے نظر آتے ہیں اور بڑے گھروں اور حویلیوں کے پھاٹکوں پر ان کی آہ وزاری اور دستکیں سنائی
دیتی ہیں۔

وہ آگے بڑھتا ہے اس کا ساتھی کتّا اب زمین پر چپ چاپ لیٹا ہوا ہے بڑی حویلی کا پھاٹک
بند ہے وہ دستک دینا چاہتا ہے مگر اس کا ہاتھ لرز کر رہ جاتا ہے۔ کچھ دیر کے تامّل کے بعد وہ
پھاٹک کے نیچے سے لیٹ کر اندر داخل ہوتا اور بیت الخلاء کی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر
آتا ہے۔

کیا دیکھتا ہے کہ وہ سب سانس کی تنگی کی وجہ سے نیم مردہ حالت میں چارپائیوں پر پڑے

تڑپ رہے ہیں اس کی جوان بیٹی دارّی بے چینی سے دائیں بائیں سر کو جھٹک رہی ہے اس کے بال کھُل کر اِدھر اُدھر دور تک پھیل گئے ہیں وہ اس سے لپٹنے کی کوشش کرتی ہے مگر پھر ہانپ کر گر جاتی ہے چھوٹا لڑکا بُری طرح ہاتھ پاؤں مارتا اور جیسے آخری سانس لیتا ہے اس کی بیوی حلال کی ہوئی گائے کی طرح نیم مُردہ حالت میں پڑی ہے تھوڑی تھوڑی دیر بعد رُوح اس کے جسم میں کلبلاتی اور تنیناں دیتی ہے۔ وہ گلی میں کسی کے قدموں کی آواز سُن کر نیچے جھانکتا ہے۔ چھوٹا ملک اس کے گھر کے دروازے کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہے اس کے پاس ہوا سے بھرے ہوئے بہت سے چھوٹے چھوٹے سلنڈر ہیں اس نے خود بھی ہوا کی نلکی ناک میں رکھی ہے۔ وہ جلدی جلدی سیڑھیاں اُتر کر نیچے آتا اور پھاٹک کا دروازہ کھول کر چھوٹے ملک کے پاؤں پکڑ لیتا ہے۔

"لوگ تو جاہل تھے ہماری باتوں پر یقین نہیں کرتے تھے" چھوٹا ملک کہتا ہے "مگر فتّیا تم تو سات آٹھ جماعتیں پڑھے ہوئے تھے اور اتنا عرصہ مل میں بھی کام کرتے رہے ہو تمہیں تو پہلے سے انتظام کر لینا چاہیئے تھا کیا تم نے اپنا اور بیوی بچوں کے نام رجسٹر کروائے ہیں؟"

"نہیں ملک جی بھول ہو گئی" وہ ہانپتے ہوئے جواب دیتا ہے۔

"تمہیں پتہ ہونا چاہیئے فتّیا کہ ساری دُنیا میں ہوا کی راشننگ ہو گئی ہے جس طرح آٹا، گھی، تیل چاول، چینی اور زندگی کی دوسری چیزیں کارڈ پہ ڈپوؤں سے ملتی ہیں بالکل اُسی طرح۔ شہروں کے لوگ تعلیم یافتہ اور عقلمند ہوتے ہیں وہاں تمام انتظامات پہلے سے کر لئے گئے گھروں، کارخانوں، دکانوں، ہوٹلوں، کلبوں، سینما گھروں، ہسپتالوں اور عبادت گاہوں یہاں تک کہ بسوں اور کاروں میں بھی گیس کا مناسب انتظام کر لیا گیا ہے۔ جگہ جگہ ایسے ڈپو قائم کئے گئے ہیں جہاں سے پیدل چلنے والوں کو کارڈ دیکھ کر گیس سلنڈر فروخت کئے جا سکیں مگر تم دیہاتی لوگوں کی عقل پر پتھر پڑے ہوئے ہیں کوئی ہماری سُنتا ہی نہیں۔ اب دیکھنا کیسے کتوں کی طرح پاؤں چاٹیں گے اور ڈپو کے باہر کسی طرح لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے ہانپتے رہیں گے مگر انہیں نہیں پتہ ہر ایرے غیرے کو ہوا کا راشن نہیں دیا جائے گا ہوا صرف ایسے لوگوں کو مہیا کی جائے گی جن کا زندہ رہنا ضروری سمجھا جائے گا۔ ہمیں

اپنے گاؤں کے لئے جو کوٹہ ملا ہے وہ تم لوگوں کی بیوقوفی اور بروقت نام نہ لکھوانے کی وجہ سے بہت تھوڑا ہے اب پتہ نہیں کتنے لوگ دوسرا ٹرک آنے تک زندہ رہتے ہیں۔"

اس کا دم اس قدر گھٹتا ہے کہ اس کا جی چاہتا ہے چھوٹے ملک سے سلنڈر چھین کر بھاگ جائے مگر اسے بیوی بچوں کا خیال آتا ہے اور وہ ہاتھ جوڑ کر منت سماجت کرتا ہے، "ہم آپ کے غلام ہیں ملک جی خدا کے لئے ہم پر مہربانی کریں صبح تک ہم سب گھٹ کر مر جائیں گے۔"

"دیکھو فتے ——" چھوٹا ملک ہمدردانہ لہجہ میں کہتا ہے، "ہوا تھوڑی ہے اور لوگ زیادہ ہیں یقیناً بلیک بھی ہوگی مگر میں دن چڑھنے پر تم لوگوں کو مناسب داموں پر لے دوں گا۔"

"مناسب دام ؟" وہ بوکھلا کر کہتا ہے "ملک جی آپ تو جانتے ہی ہیں جب سے مل کی نوکری چھوٹی ہے ہم اکثر فاقے کرتے ہیں ہمارے پاس دام کہاں —— ہم آپ کی خدمت . . . . "

"اچھا۔" چھوٹا ملک رازدارانہ لہجے میں کہتا ہے "ان لوگوں کے لئے جو تابعدار ہیں اور وہ جو اس کا وعدہ کریں اور اس پر قائم رہیں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ تم اس طرح کرو کہ داڑی والی شرط منظور کر لو —— باقی سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اُسے یاد آتا ہے ایک بار اس نے داڑی کے سلسلے میں چھوٹے ملک کو ڈانٹ پلائی تھی اور دوبارہ اس کی طرف میلی آنکھ اٹھانے پر آنکھ نکال دینے کی دھمکی دی تھی مگر یہ تو ان دنوں کی بات ہے جب ہوا میں سے کچھ نہیں نکالا گیا تھا جب ہوا پر قبضہ نہیں ہوا تھا اور اس کی راشن بندی نہیں ہوئی تھی۔ لوگ گھر بیٹھے، کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرتے ہر جگہ آسانی سے سانس لے سکتے تھے اور انہیں اپنے ساتھ گیس سلنڈر نہیں اٹھانا پڑتے تھے۔ ہوا چلتی تھی تو پرندے چہکتے اور بچے کھلکھلاتے تھے۔ ہوا کے پاؤں میں بیڑیاں نہیں تھیں زنجیریں ہوتی تھیں ہوا خوشبو اور زندگی کا پیغام لے کر قریہ قریہ گھومتی تھی مگر کہیں کوئی حاجت مند نہیں ملتا تھا۔ وہ وقت اور تھا یہ وقت دوسرا ہے وقت کے ساتھ اسے بھی بدل جانا چاہیئے ورنہ داڑی ہی نہیں وہ سب دم گھٹنے سے مر جائیں گے۔ وہ فاقے کر کے زندہ رہ سکتے تھے مگر ہوا کے بغیر رات کا باقی حصہ بھی بسر نہیں ہو سکتا تھا اور کیا پتہ اب تک داڑی اور اس کی ماں زندہ

بھی ہیں کہ نہیں وہ ہانپتے ہوئے گھگھیا کر کہتا ہے۔

"مجھے منظور ہے ملک جی ــــ آپ جلدی کیجیے ــــ خدا کے لیے"

چھوٹا ملک اُسے گِن کر تین سلنڈر دیتا ہے۔

دونوں بڑی حویلی کے کھلے پھاٹک کی راہ چھت پر آتے ہیں۔

سلنڈر کی گیس سونگھتے ہی اس کی بیوی اور بیٹا ہوش میں آجاتے ہیں۔ ساتھ والی چارپائی پر چھوٹا ملک دارّی کو ہوش میں لاتا اور.......!

وہ آسمان کی طرف مُنہ کر کے روتے کتوّں یا آپس میں خوفناک غراہٹوں سے لڑتی بلیوں یا پھر اپنے ہی گلے سے نکلنے والی ہولناک آوازیں سُن کر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا ہے اور بھاگ کر کمرے سے باہر آتا ہے۔

باہر گھُپ اندھیری رات ــــ ہوا بند ــــ اُوپر گرد آلود آسمان اور بجھتے ہوئے تارے نیچے ہانپتے ہوئے بیل کے سینگوں پر ڈولتی زمین ــــ وہ بیوی اور بچوّں کو بلند آواز میں پکارنے لگتا ہے۔

اندھیرے سے اندھیرے تک

اس شہر کے لوگوں کو روپے پیسے سے بہت محبّت تھی اور انہیں نوٹ بے حد اچھے لگتے تھے۔ وہ خوشی کے اظہار کے لئے ایک دوسرے کے گلے میں نوٹوں کے ہار پہناتے اور شادی بیاہ کے موقعوں پر ریزگاری کا مینہہ برساتے۔ لیکن پھر ایک روز گھنا سیاہ بادل گھر آیا اور اس شہر پر سچ مچ روپوں کی بارش ہونے لگی۔

رات بھر شہر پر دھن برستا رہا۔

لوگ سو کر اُٹھے تو دالانوں میں اور چھتوں پر ہر طرف روپے بکھرے ہوتے تھے درختوں کی ٹہنیوں میں نوٹ اٹکے ہوئے تھے اور گلیوں بازاروں، سڑکوں اور کھیتوں میں ہر طرف سکّے چمک رہے تھے۔ جلدی جاگنے والوں نے جلدی جلدی اپنے دالانوں، گھروں کی چھتوں، کھیتوں اور کھیتوں میں کھڑے درختوں سے روپے اتار اتار کر اپنے اپنے گھر بھر لئے ـــــ مگر وہ جن کی آنکھ دیر سے کھلی تھی یا جن کے اپنے مکان، چھتیں یا کھیت نہیں تھے، خالی ہاتھ رہ گئے اور اپنی اپنی محرُومی کے گلے میں باہیں ڈال کر رونے لگے۔ اُن کے رونے کی آواز سُن کر برآمدوں میں چہچہاتی اور چھجّوں پر پھُدکتی چڑیاں آپس میں کھسر پھُسر کرنے لگیں منڈیروں پر کلول کرتے ہوئے کوّوں نے قہقہے لگائے اور درختوں سے اُتر کر گلہریاں اپنی دُموں کے کلف لگے طرّے لہرا کر ناچنے لگیں۔

وہ دن اس شہر کی تاریخ کا سب سے بڑا خرید و فروخت کا دن تھا۔ اس روز لوٹھے دن کی پسلی سے قبل از وقت شام پیدا ہوئی اور سڑکوں پر کھڑے کھمبوں کی بے نور آنکھوں میں سیاہی گھُل گئی اندھیرا پھیلنے سے پہلے بازار کی ہر چیز فروخت ہو چکی تھی دکانوں اور گوداموں کے پیٹ خالی ہو گئے تھے اور ان کے مُنہ

کھُلے رہ گئے تھے۔

اگلی صبح بازار پہلے ہی کھُلے تھے مگر کہیں کوئی گاہک تھا نہ دکاندار۔ کسی دکان میں کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ بازار میں صرف بھیک مانگنے والے تھے جو دکانوں کے ویران تھڑوں کے آگے کھڑے بازار کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے گاڑی سے رہ جانے والے مسافر خالی پلیٹ فارم کو دیکھتے ہیں۔ ان کے کھُلے ہوئے مُنہ اور پھٹی ہوئی آنکھیں دیکھ کر دکانوں کی چھتوں اور دیواروں سے چمٹی ہوئی چھپکلیاں ان پر تھوک تھوک کر ہنسنے لگیں۔ مکڑیاں اپنے مُنہ سے لمبے لمبے تار نکال کر پینگیں جھوٹنے لگیں۔ اور بھڑیں ڈنک میں ڈنک ڈال کر ککلی ڈالنے لگیں۔

پھر بازار خاموش ہو گئے اور اُلّو بولنے لگے۔

کارخانے بند ہو گئے اور کُتّے بھونکنے لگے۔

سڑکیں سنسان ہو گئیں اور جگہ جگہ کالے مُنہ والی ویرانی پھوہڑی ڈال کر بیٹھ گئی۔

سُورج اب بھی مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب ہوتا تھا لیکن اس کی کرنوں میں روشنی اور چمک نہ رہی تھی جو زیرِ زمین کوٹھڑیوں میں بھی اندھیرے کی گردن دبوچ لیتی ہے۔ دھوپ میں وہ تپش نہ رہی تھی جو محنت کشوں کے بدنوں سے پسینے کا عطر کشید کرتی ہے۔ ویسے بھی لوگ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے تھے۔ جب ان کا نیچے والا ہاتھ اُوپر والے ہاتھ کے بوجھ سے تھک جاتا تو وہ ہاتھوں کو اُوپر نیچے کر لیتے۔ زندگی اب اسی حرکت سے شناخت ہوتی تھی۔ بہت سے لوگوں کو کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی بہت سے لوگوں کو کرنے کے لئے کام ملتا نہیں تھا۔ ہر روز صبح اور دیر سے ہوتی اور شام اور جلدی پڑ جاتی۔ دن بے حد چھوٹے اور راتیں نہایت لمبی ہوتی جا رہی تھیں یوں لگتا تھا کسی روز دن اور رات کا فرق مٹ جائے گا اور پتہ چلانا مشکل ہو جائے گا کہ کب رات ختم ہوئی اور کب دن چڑھا۔

بُزدل اور ناتواں لوگوں نے صبر و تحمّل کو اپنا شعار بنا لیا تھا اور گھاس پھونس سے پیٹ بھر کر زندگی کی گاڑی کھینچ رہے تھے مگر وہ جو بزدل اور ناتواں نہیں تھے انہوں نے کمزور اور بُزدل اہلِ ثروت سے سب کچھ چھین کر اپنی رہائش اور حیثیت تبدیل کر لی تھی۔

آہستہ آہستہ شہر میں امن وامان کی صورتحال خراب ہونے لگی بزدل اور ناتواں لوگ گھاس پھونس کھاتے کھاتے اُکتا گئے اور نقب لگانے اور ڈاکے ڈالنے کے منصوبے بنانے لگے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر اہلِ ثروت کے بدنوں میں مارے خوف کے خون خشک ہونے لگا انہوں نے شہر کے کٹھ پتلی حاکموں سے مل کر اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے نئے قوانین وضع کرائے اور مجرموں کے لئے کڑی سزائیں مقرر ہوئیں۔

نئے قوانین کے لاگو ہوتے ہی شہر کو چُپ کی گرد کے مٹیلے بادلوں نے ڈھانپ لیا اور سارے شہر میں سناٹا چھا گیا اس گونگی بہری اور اندھی چُپ سے گھبرا کر جانور جنگلوں کی طرف ہجرت کر گئے، پرندوں کے ڈار کے ڈار اپنے بے بس اور کھلی چونچوں والے بچوں کو گھونسلوں میں چیختا چھوڑ کر پہاڑوں کی طرف پرواز کر گئے۔ شہد کی مکھیاں چھتے اور مکڑیاں تنے تنائے جالے چھوڑ کر چلی گئیں۔ چوہے، بلیاں اور کتے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے شہر سے دُور نکل گئے۔

مگر شہر میں اب بھی بہت سی چیزیں تھیں۔ ننگے بھوکے لوگوں اور اہلِ ثروت کے علاوہ بھڑیں تھیں اور چھپکلیاں تھیں جنہوں نے الگ الگ شہتیروں پر قبضہ کر لیا تھا۔ دیمک بھی جس نے جگہ جگہ ننھے ننھے گھروندوں پر مشتمل بستیاں بسا لی تھیں اور گلہریاں تھیں جو ہر جگہ دُموں کے کلف لگے طرے بلند کئے ٹہلتی پھرتی تھیں۔

اہلِ ثروت کو کسی چیز کی کمی نہ تھی انہوں نے قحط کے دنوں کے لئے بہت کچھ جمع کر لیا تھا مگر ان کی یہ خوشحالی اس دلہن کی طرح تھی جو شوہر کے سینے پر سر رکھے اپنے آشنا کی یاد میں تڑپ رہی ہو، دولت کا تقاضا تھا کہ ضرورت ہو نہ ہو کچھ خریدا جائے۔ مگر خریدنے کے لئے کوئی چیز نہیں ملتی تھی۔ آخر انہوں نے نئی راہیں نکالیں اور خریداری کی ہوس پوری کرنے کے لئے نئی نئی اور عجیب وغریب چیزوں کی خرید و فروخت کا رواج ہوا۔ مثلاً ایمان، اصول، اخلاق، شرافت، شرم وحیا، عصمت اور غیرت وغیرہ اور آخر کار بیچنے والے خود بھی بکنے لگے۔ بکنے والے دکانوں کے خالی تھڑوں پر آ کر بیٹھ جاتے اور پیٹ بھرنے کے لئے گاہکوں کے ہر حکم کی تعمیل کرتے اور ان کی ہاں میں ہاں ملاتے۔ خریدار من مانی شرائط پر نت نئی خواہشیں پوری کرتے اور نئے نئے تجربات سے زندگی کے جمود کو توڑنے کی کوشش کرتے شہر کے مرغ ختم ہو چکے تھے یا شہر چھوڑ کر چلے گئے تھے وہ لڑائی

کا شوق پورا کرنے کے لئے بھوکے اور نڈھال جوانوں کو لڑاتے اور تالیاں پیٹتے۔

کنواری اور جوان سال لڑکیوں کے تھنوں میں دودھ تلاش کیا جاتا۔ حاملہ عورتوں کے عُریاں رقص دیکھے جاتے اور نابالغوں اور بوڑھوں کے جنسی ملاپ پر بغلیں بجائی جاتیں۔ سُورج اب اور دُور ہو گیا تھا اور بہت دیر سے طلوع اور بہت جلد غروب ہونے لگا تھا۔ سڑکوں پر جگہ جگہ پھوہڑی ڈال کر بیٹھی کالے مُنہ والی ویرانی اب دن میں بھی ننگے بدن پھرنے لگی تھی۔

پھر ایک رات۔

جب سب لوگ جی بھر کر سو چکے تھے ___ سیاہ بادل پھر اُمڈا لیکن اس بار نوٹوں اور روپوں کی بجائے سنگریزے اور اولے برسے۔ اس سے پہلے انہوں نے اتنے بڑے اولے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ سنگریزوں اور اولوں سے مکانوں کی منڈیریں ٹوٹ گئیں، چھتوں میں جا بجا سوراخ ہو گئے اور درختوں کے تمام پتے جھڑ گئے۔

بادل برس کر چلا گیا مگر نہ تارے نکلے اور نہ چاند ہی طلوع ہوا ہر طرف گھپ اندھیرا تھا اور ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دیتا تھا انہوں نے آگ جلانے کے لئے ماچسیں رگڑیں مگر وہ بھیگ گئی تھیں۔ انہوں نے چولہے دیکھے مگر آگ بجھ چکی تھی انہوں نے ہر طرف آگ کی تلاش کی مگر آگ، روشنی اور حرارت کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

پھر جب گھڑیوں پر سُورج نکلنے کا وقت ہوا انہوں نے مشرق کی طرف روشنی کا ایک چھوٹا سا نقطہ دیکھا وہ گھروں سے باہر نکل آتے اور روشنی کے اس نقطے کو دیکھنے لگے جو لمحہ بہ لمحہ ان کے قریب آ رہا تھا جب روشنی کا ننھا سا نقطہ قریب آیا تو انہوں نے دیکھا وہ ایک اکیلا جگنو تھا جو اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ان کو چاند کی طرح چمکتا محسُوس ہوا وہ اس کے پیچھے پیچھے بازاروں، سڑکوں اور کھیتوں میں بھاگنے لگے کہ اب وہی جگنو اُن کا چاند تھا اور وہی اُن کا سورج تھا۔

زوال کے اسباب

کھدائی کا کام برابر جاری ہے۔

اور نت نئی چیزیں سامنے آ رہی ہیں۔

اس لئے ماہرین کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے میں دشواری محسوس کر رہے ہیں۔ مثلاً پہلے ان کا خیال تھا کہ وہ غذا کی قلت کا شکار ہو گئے تھے لیکن جب مزید کھدائی کے بعد اناج سے بھرے ہوئے گودام دریافت ہوئے تو ماہرین شش و پنج میں پڑ گئے۔

ماہرین کی کمیٹی کے ایک ممتاز رکن نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ لوٹ مار اور چوری ڈکیتی اس سلسلے میں عام تھی اور گھر میں، غذائی اجناس اور خوبصورت عورتوں کو رکھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس لئے خوبصورت عورتوں کی شکلیں بگاڑ دی جاتی تھیں یا ان کے دام وصول کر لئے جاتے تھے۔ نقدی اور غذائی اجناس کے بڑے بڑے بینک قائم ہو گئے تھے لوگ سال بھر کا غلہ ان بینکوں میں جمع کرا دیتے تھے۔ لیکن ان بینکوں کا حساب و کتاب کسی ایسی اجنبی زبان میں لکھنے کا رواج تھا جو ان لوگوں کی بولنے کی زبان سے بے حد مختلف تھی۔ بعض اوقات لکھنے والا خود بھی اپنا لکھا ہوا نہیں پڑھ سکتا تھا اس لئے غذا کے اکاؤنٹ ہولڈروں کو غذا حاصل کرنے میں غیر معمولی دشواریاں پیش آتی تھیں یہی ممتاز رکن رپورٹ میں آگے جا کر لکھتا ہے کہ اجنبی زبان کی تحریروں کو پڑھنے کے لئے بینک کے عملے کو بڑی جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔ انہیں موٹی موٹی لغاتیں اور امدادی کتابیں درکار ہوتی تھیں جن کی مدد سے

وہ متعلقہ فائل پڑھنے کی کوشش کرتے تھے اس لئے اکاؤنٹ ہولڈروں سے اس کی بھاری فیسیں بھی لیتے تھے۔ بعض اوقات فائل میں درج تشریحوں، وضاحتوں اور منافع کی شرائط وغیرہ پڑھنے میں اتنے دن لگ جاتے تھے کہ اکاؤنٹ ہولڈر یا اس کا کنبہ غذا کی قلت کا شکار ہو جاتا تھا۔ رپورٹ میں اس بات کے امکان کا ذکر بھی ملتا ہے کہ بینک کے گوداموں میں پڑی پڑی اجناس گل سڑ کر زہریلی ہوگئیں اور ان سب کی ہلاکت کا سبب بنیں۔

پھر کچھ ماہرین نے یہ خیال پیش کیا کہ وہ بھوک سے نہیں کسی وبائی بیماری کے نتیجے میں ہلاک ہوئے تھے۔ لیکن پھر اسی بیماری سے بچاؤ کے ٹیکے اور تیر بہدف دوائیوں کے بڑے بڑے ڈرگ اسٹورز دریافت ہوتے تو ماہرین میں پھر اختلاف رائے پیدا ہوگیا۔ بعض کہتے ہیں کہ وبائی امراض سے بچاؤ کے ٹیکے اور تیر بہدف دوائیاں چند ایک لوگوں کے قبضے میں تھیں اور وہ ان کے بدلے بھاری رقمیں حاصل کرتے تھے۔ جب لوگوں کے پاس نقدی ختم ہوگئی تو وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے۔ ان کی بے کفن لاشیں گلتی سڑتی رہیں جس سے فضا میں ایک نہایت مہلک مرض کا زہر پھیل گیا اور اس وقت تک اس مہلک مرض کی دوا ایجاد نہیں ہوئی۔

یہ سب امور ابھی زیر بحث ہیں کہ ایک اور بات نے ماہرین کو پریشان کر دیا ہے۔ شہر کے مختلف حصوں سے حاصل کی گئی کھوپڑیوں کی لیبارٹری رپورٹ ان کے سامنے ہے اور وہ کئی دنوں سے نئی بحث میں الجھے ہوئے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ ایک ہی عہد کی ان کھوپڑیوں میں اس قدر فرق کیوں ہے۔ اگر وہ کھوپڑیاں کھدائی کے وقت ملبے کی مختلف سطحوں (LAYERS) سے برآمد ہوئی ہوتیں تو یہ امر اس قدر حیران کن نہ ہوتا مگر صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں تک کہ ان دو کھوپڑیوں کے درمیان بھی نشوونما اور ارتقاء کے لحاظ سے زمین و آسمان کا فرق ہے جو گودام کے ایک دروازے کے اندر اور باہر سے بیک وقت برآمد ہوئی ہیں۔

رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی زندگی کے ارتقاء کے ابتدائی دور سے لے کر زوال کے دن تک ہر صدی کے لوگ اس شہر میں ایک ساتھ زندہ تھے۔ اڑن کھٹولہ قسم کی چیز کے قریب سے جو کھوپڑی حاصل

کی گئی ہے اس کے اور گدھا گاڑی کے قریب سے ملنے والی کھوپڑی میں ارتقائی لحاظ سے صدیوں کا بُعد ہے حالانکہ رپورٹ سے صاف ظاہر ہے کہ گدھا گاڑی والے انسان کی موت اَڑن کھٹولہ قسم کی چیز گرنے اور ٹکرانے سے ہوئی تھی۔

تو کیا وہ سب ذہنی طور پر ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوتے ہوئے بھی جسمانی طور پر ایک ہی عہد کے لوگ تھے ؟ ماہرین کی کمیٹی کے سربراہ کا خیال ہے کہ اسی ایک نکتے سے شہر کے زوال کے اسباب کا صحیح صحیح کھوج لگانے میں کامیابی حاصل ہو جائے گی۔

خواہشیں سراب ہیں

کیا کہا کتنے برس ؟

برس نہیں دن ہوں گے شاید آپ کو غلطی لگی ہے ابھی ابھی تو میں پنگھوڑے میں لیٹا منہ سے بوتل لگائے بڑے مزے سے دودھ پی رہا تھا اور وہ عورت جس کے بطن سے میں نے جنم لیا ابھی ابھی یہاں تھی آپ میری بات پر یقین کیجئے میں بالکل سچ کہتا ہوں۔ میں نے ابھی چند روز ہوئے زندگی کی ابتدا کی ہے یقیناً آپ کو مغالطہ ہوا ہے۔ مہربانی کر کے ذرا پڑتال کر لیجئے۔ وقت کے سلسلے میں ہمیشہ مجھ سے ناانصافی ہوتی رہی ہے مجھے یاد ہے ایک بار میں امتحان کا پرچہ دے رہا تھا اور ابھی میں نے اپنا رول نمبر ہی لکھا تھا کہ ممتحن کی گرجدار آواز سنائی دی " ہاف دی ٹائم از اوور "

اس کے بعد مارے گھبراہٹ کے میں کچھ بھی نہ لکھ سکا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اب پھر!!

غالباً آپ نے وہ سب مہ و سال بھی میرے کھاتے میں ڈال دیئے ہیں جنہیں میں نے خود نہیں گزارا وہ خود مجھے روندتے ہوئے گذرے ہیں لیکن آپ کو دیکھنا ہوگا کہ ان شب و روز میں سے کتنے میرے حصے میں آئے اور کتنے ایسے تھے جنہیں میں نے خود کو کراسے پر چڑھا کر بسر کیا۔ جن شب و روز نے مجھے زندگی میں کوئی لذت یا خوشی نہیں دی انہیں میرے کھاتے میں ڈالنا ہرگز درست نہیں۔ انصاف کا تقاضہ ہے کہ وہ سب شب و روز جو ایک جیسے تھے اور اَن گنت تھے انہیں ایک ہی شمار کیا جائے اور ان سب برسوں کو بھی میرے حساب

میں شمار نہ کیا جاتے جو میں نے لوگوں اور چیزوں کے نام یاد کرنے میں صرف کئے۔ یہ چیز شی ہے۔ وہ بادل ہے یہ پنکھا ہے وہ تختی ہے۔ پھر مجھے الف سے انار اور ب سے بکری رٹنے کی تلقین کی گئی۔ حالانکہ جب انار اور بکری موجود تھے تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ انار کو بکری اور بکری کو انار کہا جا سکتا لیکن میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی ساری چیزوں کے نام رکھ دیئے گئے تھے اور میرے لئے ضروری قرار دیا گیا تھا کہ میں ان ناموں اور اصولوں کو ازبر کروں اور ان سے سر مو ادھر اُدھر نہ ہوں۔

انار اور بکری کے بعد بھی برسوں مجھے لوگوں اور چیزوں کے نام یاد کرنا پڑتے اور میرے قیمتی دن، مہینے اور سال بکریوں۔ گھوڑوں۔ تختیوں اور بادلوں کی نذر ہو گئے اسی طرح ہر طرف آدمی ہی آدمی تھے سب کی شکلیں ایک جیسی تھیں بہت تھوڑا تھوڑا فرق تھا اور بظاہر یہی لگتا تھا کہ ایک ہی آدمی بھیس بدل کر ہر جگہ گھومتا پھرتا ہے۔ لیکن پھر پتہ چلا کہ انہوں نے ایک دوسرے کے الگ الگ نام رکھے ہوئے تھے اور مجھے یہ نام یاد کرنا پڑے نہ صرف نام بلکہ ناموں کے ہجے، ہجوں کی مخصوص شکلیں آوازیں۔ زیریں زبریں پیشیں!! مجھے نہایت افسوس ہے میں اس فیصلے کو نہیں مانتا۔

میرے ساتھ ہمیشہ زیادتی کی گئی ہے یہاں تک کہ میرے پیدا ہونے میں بھی میرا عندیہ معلوم نہیں کیا گیا کیوں ابا؟

کیا تم دونوں میاں بیوی میرے وجود میں آجانے سے پریشان نہیں ہو گئے تھے؟ اور اماں! کیا تم نے اپنی فطری جسمانی بناوٹوں میں تبدیلی کے خوف سے مجھے اپنی کوکھ سے نکال باہر کرنے کے لئے جتن نہیں کئے تھے؟ یقین جانو ماں میں نے تمہارے زہر آلود بطن کی قید میں بڑی مشکل سے دن گذارے۔ وہ زہر اب تک میرے رگ و پے میں رچا ہوا ہے اگر میرے بس میں ہوتا تو میں کسی ماتا سے بھرپور کوکھ میں منتقل ہو جاتا لیکن سارے فیصلے مجھ پر ہمیشہ ٹھونسے گئے ورنہ اگر میری اپنی پسند اور میری مرضی کو دخل ہوتا تو میں خود فیصلہ کرتا کہ میں کس صدی میں کہاں اور کن لوگوں کے درمیان پیدا ہونا چاہتا ہوں لیکن والدین کے انتخاب سے لے کر رنگ نسل اور عقیدے کے انتخاب تک میں میرا اپنا کوئی چوائس نہ تھا۔ میرا رنگ، شکل و صورت اور آنکھیں جن کی وجہ سے بعد میں کئی طرح کی پیچیدگیاں اور مشکلیں پیدا ہوئیں میرا انتخاب بالکل نہیں تھیں۔ میں جس گھر میں پیدا

ہوا اس سے بہتر اور روشن گھر اور بھی موجود تھے۔ میرے والدین سے بہتر لوگ میرے والدین ہو سکتے تھے اگر میں منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتا تو مجھے بہت سے کام کئے کرائے مل جاتے اور میرا بہت سا وقت بچ جاتا لیکن مجھے رشتہ دار بھی بنے بنائے ملے —— یہ بدمزاج اور بدصورت آدمی میرا ماموں ہے۔ یہ تین آدمیوں کی خوراک ایک وقت میں کھا جانے والا حریص شخص میرا چچا ہے۔ یہ چڑیل صورت عورت میری پھوپھی ہے اور یہ بھوکی بلی کی طرح ہر وقت میاؤں میاؤں کرنے والی عورت میری خالہ ہے۔ ان سب کا کام میرے راستے میں روڑے اٹکانا۔ میری کامیابیوں پر حسد کرنا اور ناکامیوں پر بغلیں بجانا تھا۔ میں زندگی بھر نیکیوں کی گٹھڑیاں اٹھائے ہر ایک دروازے پر دستک دیتا رہا مگر مجھے نفرت اور حسد کے سوا کچھ نہ ملا۔

"خالہ جان اکبر اچھا لڑکا نہیں ہے آپ ثمینہ کا رشتہ وہاں نہ کریں۔"

"بہن میں سب کچھ جانتی ہوں۔ یہ اکبر سے اپنی بہن کا رشتہ کرنا چاہتا ہے۔"

"اکبر نے ثمینہ کو طلاق دے کر اس چنڈال سے شادی کر لی ہے۔"

"ہائے بہن۔ میری بچی کو ان لوگوں کی نظر کھا گئی ہے۔"

مجھے اپنے محدود اور مخصوص ماحول سے دوستوں کا انتخاب کرنا پڑا۔ میں انہیں باری باری سالہا سال تک آزماتا رہا اور ناکامی کا منہ دیکھتا رہا۔ وہ مصیبت کے وقت کام آنے کے اصول پر اس قدر سختی سے کاربند رہے کہ میرے کام آنے کے لئے وہ مجھے ہر خوشی سے محروم رکھنے اور اپنے احسانات کے بوجھ سے کچلنے کی کوشش کرتے رہے۔ میں نے زندگی کا بہت سا حصہ انہیں آزمانے پر صرف کر دیا آخر اتنے بڑے نقصان کی کچھ تو تلافی ہونی چاہیئے۔

ماحول کے انتخاب میں بھی میری پسند شامل نہیں تھی۔ میں جس گلی میں چلتا وہ آگے جا کر بند ہو جاتی۔ سارے راستے گھوم پھر کر واپس آ جاتے میں نے اپنے اور ماحول کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ اتنا تنگ اور سخت تھا کہ میں بار بار اس کی خلاف ورزی کے جرم میں پکڑا جاتا اور تنہائی کے زنداں میں ڈال دیا جاتا۔ ادھر میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی ساری اچھی اور خوب صورت چیزوں پر لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ مجھے جو چیز بھی پسند آتی اس پر پہلے سے کسی اور کے نام کی مہر

لگی ہوتی ۔ میں جس سکول میں پڑھنا چاہتا تھا اس میں مجھے داخلہ نہ ملا۔ میں جو پیشہ اختیار کرنا چاہتا تھا اس میں میرے لئے کوئی گنجائش نہ نکلی۔ میں جو چیز ایجاد کرنا چاہتا تھا وہ لوگوں نے میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ایجاد کرلی تھی۔ میں جو کچھ سوچتا وہ کہیں نہ کہیں پہلے سے سوچا جا چکا ہوتا۔ یہاں تک کہ مجھے جو لڑکی پسند آئی وہ کسی اور سے محبت کرتی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنے پیدا ہونے والے بچوں کی صورتیں نظر آنے لگتیں اور ان کی کلکاریاں سنائی دینے لگتیں۔ ہم ایئر کنڈیشنڈ ریسٹورنٹ کے خوب صورت کیبن میں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں سامنے رکھے گھنٹوں باتیں کرتے۔ وہ بہت کم کھاتی تھی۔ میرا جی چاہتا کہ وہ میری منگائی ہوئی ساری چیزیں چٹ کر جائے میرا تو یہ بھی جی چاہتا میں خود چائے کی پیالی میں حل ہو کر گھونٹ گھونٹ اس کے حلق سے اتر جاؤں۔ وہ اکثر کہتی۔

"آپ بہت اچھے ہیں بالکل امجد کی طرح دلچسپ اور پُر لطف باتیں کرتے ہیں۔ میں آپ کو امجد سے ملاؤں گی۔ آپ ہماری شادی پر آئیں گے نا؟"

میں اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن وہ امجد سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ میری شادی راشدہ کی بجائے عذرا سے ہو گئی تاہم میرا خیال تھا میں نے عذرا سے شادی کر کے اپنے بہت سے مسائل حل کرنے کے لئے ایک چھلانگ لگائی ہے اور واقعی میرے بہت سے مسائل حل بھی ہو گئے لیکن ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا کیوں عذرا! تم خود کچھ نہیں کہو گی؟

"ڈارلنگ میں تم سے شرمندہ ہوں۔ کاش میں تمہیں وہ سارے برس واپس لوٹا سکتی جو تم نے میری حسرت میں گزارے لیکن یقین کرو ڈیئر میں بے حد مجبور تھی۔ تم اتنے اچھے تھے کہ مجھے ہر وقت تمہارے چوری ہو جانے کا دھڑکا لگا رہتا تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں خوشبوؤں میں بسی زیور تعلیم کے علاوہ سونے کے زیورات سے لدی پھندی اور لاکھوں کے جہیز میں لپٹی لپٹائی تمہاری باہوں میں آئی تھی تو تم کتنے خوش تھے تم نے اس رات ساری غلیظ اور فاحشہ یادوں کو گھر سے باہر نکال دیا تھا اور ایک بار بھی باہر جھانک کر نہیں دیکھا تھا لیکن شک کی چیونٹیاں میرے بدن پر برابر کاٹتی رہیں جب روز دیگیں چڑھتیں اور قورمے اور بریانی کی اشتہا انگیز مہک ننگے بدن گلیوں میں پھرنے لگی تو تم نہایت مسرور اور مطمئن تھے کہ تمہارے ذہن سے بھاگے

ہوئے تصورات، گلی گلی بھیک مانگتے اور لوگوں کی جیبیں کاٹتے آوارہ گرد بچوں کی طرح گھر لوٹ آئے تھے لیکن مجھے لگتا تھا کہ ماضی کی یادیں تمہارے چاروں طرف آلتی پالتی مار کر بیٹھی رہتی ہیں اور تمہیں ایک لمحہ کے لئے بھی تنہا نہیں چھوڑتیں۔

یقیناً میرے مدثر مندہ ہوں ڈارلنگ کہ شادی کے چند ہی دنوں بعد میرے وجود سے فالتو اور مصنوعی چھلکے ایک ایک کر کے اُترنے لگے اور میرے اندر سے جھنجھلاتی چلاتی بات بات پر رُوٹھتی۔ الزام تراشیاں کرتی۔ طعنے مہنے دیتی اور اپنے میکے کی امارت و ثروت کی دھونس جماتی اصلی اور خالص عذرا نکل آئی۔

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ تمہیں ایک خوبصورت بچے کی شدید خواہش تھی لیکن مجھے بچوں کے خیال ہی سے گھن آتی تھی۔ ایک بار تم نے میرے ساتھ دھوکہ کیا تھا لیکن میں نے ایک ماہر دایہ کی خدمات حاصل کر کے تمہارا دھوکہ جلد ہی تمہیں لوٹا دیا تھا۔ اس کے بعد مجھے یاد ہے کہ تم اور زیادہ اُداس رہنے لگے تھے اور تمہاری اُداسی دیکھ کر مجھے تمہارے بھاگ جانے اور چوری ہو جانے کا خوف اور زیادہ لگنے لگا تھا اور حالانکہ میں نے تمہارے گلے میں جہیز کا طوق اور پاؤں میں بھاری حق مہر کی بیڑیاں ڈال رکھی تھیں اور ایجاب و قبول کے الفاظ کی کھونٹیاں گاڑ کر تمہارے چاروں طرف اپنے وجود کا خیمہ مضبوطی سے گاڑ لیا ہوا تھا۔ پھر بھی مجھے دھڑکا لگا رہتا تھا کہ تم میری حراست سے فرار نہ ہو جاؤ۔"

آپ نے دیکھا۔ میں برسوں عذرا کی قید میں رہا ہوں۔ اگر اسیری کے ان برسوں کو میری عمر سے منہا نہ کیا گیا تو یہ بہت بڑی ناانصافی ہو گی۔ ہاں یہ درست ہے کہ فرار ہونے کے لئے چور راستے بھی ہوتے ہیں اور میں ہر رات عذرا کے پہلو میں اپنے جسم کی کینچلی چھوڑ کر فرار ہو جاتا لیکن میں کہیں دُور نہیں جاتا تھا۔ وہ ماں بیٹا مجھے اپنے بیڈ روم کی سامنے والی دیوار میں نظر آتے تھے۔

جب کبھی میں تنہا ہوتا یا عذرا محوِ خواب ہوتی۔ وہ عورت مجھے اپنے کم سن بچے کے ساتھ ایک ٹیلے پر کھڑی نظر آتی۔ وہ ایک ایسا نغمہ تھی جس میں بیک وقت کیف و انبساط اور رنج و محن کے جذبات پیدا کرنے کی تاثیر تھی۔ اسے دیکھ کر میں کبھی خوشی کے تر و تازہ ٹھنڈے میٹھے پانیوں میں غوطے لگاتا کبھی اُداسیوں کے لق و دق صحرا میں پیاس کے مارے ایڑیاں رگڑتا۔

کبھی کبھی میں اٹھ کر دیوار کے پاس چلا جاتا تو بچّہ مجھے دیکھ کر ماں کی گود میں ہمکنے اور کلکاریاں مارنے لگتا۔ پھر جب میں بچّے کو پیار کر رہا ہوتا وہ عورت پاس ہی کھڑی ہم دونوں کو ماتا اور محبت سے لبریز نظروں سے دیکھتی اور اپنی پھٹی پُرانی اوڑھنی سے خُوشی کے آنسو پونچھتی۔ اس کا تار تار لباس اور جسم پر جا بجا خراشوں کے نشان ویرانے کی صعُوبتوں کی غمازی کرتے پھر دُور سے کسی خونخوار درندے کی آواز سُنائی دیتی تو وہ خوف زدہ ہو کر مجھ سے لپٹ جاتی۔ اسی لمحے عذرا کی چیخ جیسی آواز گھر بھر میں گونجتی اور میرے ہونٹ جو ابھی ابھی محبّت کے زمزم سے تر ہوتے اچانک خشک ہو جاتے اور منہ میں ریت بھر جاتی۔

اس عورت کو دیکھ کر میرا جی چاہتا کاش میں اس کے بطن سے جنم لے سکتا۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ شاید وہ عورت میری اصلی ماں تھی میں جس کے بطن سے جنم نہیں لے سکا تھا۔ اور وہ بچّہ شاید میں خود تھا۔

آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ عذرا کی معیت میں گزارے ہوئے مرؤ سال کسی طرح بھی میرے اپنے نہیں تھے اور انہیں میرے حساب میں ہرگز شمار نہیں کرنا چاہیے۔ سوائے ان چند لمحوں کے جب جب میں نے اس کے پہلو میں لیٹے لیٹے ٹیلے پر کھڑی عورت کے کم سن اور خوبصورت بچّے کو پیار کیا۔

اور آپ کو اس بات کا اندازہ بھی ہوگا کہ جب میں نے ہوش سنبھالا تو ساری اچھی جگہوں۔ خوبصورت آبادیوں اور پُر محل شاپنگ سنٹروں کی الاٹمنٹیں ہو چکی تھیں اور لوگوں نے ہر جگہ اپنے اپنے نام کی تختیاں آویزاں کر رکھی تھیں۔ مجھے جو مکان بھی رہنے کے لئے پسند آتا وہ کسی دوسرے کی ملکیّت ہوتا۔ مجھے اپنی مرضی اور پسند کے خلاف کام کرنا پڑتا۔ ایسا کام جس سے مجھے نفرت ہوتی۔ میں ہر روز ایک ہی طرح کا کام کر کر کے اُکتا جاتا اور میں ہر روز ایسے افسروں کی شکلیں دیکھتا جن کی صُورتوں سے مجھے گھن آتی تھی۔ میں انہیں سلام کرنے انکی ہاں میں ہاں ملانے اور ان کے احکامات بجا لانے کی اذیتیں اٹھاتا۔ میں اپنے جائز حقوق کے لئے آواز اٹھاتا تو مجھے بتایا جاتا کہ مجھے میری صلاحیتوں کے مطابق معاوضہ ملتا ہے لیکن میرے ذہن میں ہر وقت یہ سوال کلبلاتا رہتا کہ مجھے بہتر صلاحیتیں کیوں نہیں ودیعت کی گئیں۔

مجھے ایسے لوگوں کے درمیان زندگی کے قیمتی دن بسر کرنا پڑے جو کسی نہ کسی چیز کے مالک بننا چاہتے تھے۔ جس کے ہاتھ جو چیز آجاتی تھی وہ اس پر سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا تھا۔ زمین کے ہر ٹکڑے پر،

ہر دفتر اور ہر کارخانے میں اژدہے پھنکارتے تھے۔ دکانوں، مکانوں، ہوٹلوں، ریستورانوں، اخباروں، بسوں، کاروں، یہاں تک کہ درختوں اور ان کے سایوں پر بھی کسی نہ کسی زہریلے سانپ کا پہرا تھا۔ ہوا، پانی اور روشنی پر بھی قبضہ ہو چکا تھا اور راشن مقرر ہو چکا تھا۔ شہر میں خوشیوں، آسانیوں اور زندگی کی سہولتوں کا قحط نہیں تھا لیکن سب پر ملکیت کی مہر لگی ہوئی تھی اور یہ سب ایسے لوگوں کے قبضے میں تھیں جو شاید زیادہ انسان تھے۔ غلامی۔ ذلت اور اذیت کے ان برسوں کو میرے حساب میں ڈالنا قطعاً قرینِ انصاف نہ ہوگا۔

"دی ٹائم از اوور"

نہیں پلیز۔ آپ کو یقیناً مغالطہ ہوا ہے ابھی تو میں نے زندگی کے پرچے کی ابتدا کی ہے۔ ابھی تو میں نے صرف چند سطریں لکھی ہیں۔ اگر آپ نے اپنے اعلان کی تصحیح نہ کی تو مارے گھبراہٹ کے میں کچھ نہ لکھ سکوں گا اور پاس مارکس بھی حاصل نہ کر سکوں گا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک بار پھر سے وقت اور پرچے کی ابتدا کی جائے۔ ویسے بھی جو چند سطریں میں نے گھبراہٹ میں لکھی ہیں وہ ٹیڑھی میڑھی ہیں۔ الفاظ لکھ لکھ کر جگہ جگہ سے کاٹے ہوئے ہیں اور ان کے ہجے بھی درست نہیں۔ آئی ایم ویری سوری سر کہ میں اب تک رف کرتا رہا ہوں، اگر مجھے ایک بار اور نئی کاپی دے دی جائے تو میں اسی پرچے کو نہایت صاف اور خوشخط لکھ سکتا ہوں۔ مجھے اپنے تجربے سے فائدہ اٹھانے کا ایک اور موقع ملنا چاہیئے۔ صرف ایک بار اور نئی کاپی دے دیجئے۔ صرف ایک چانس اور ــــ پلیز!!

"دی ٹائم از اوور۔ ٹائم از اوور!"

بچھڑے ہوئے ہاتھ

وہ جب سے اپنے جسم سے بچھڑا ہے دو لخت ہو گیا ہے اور اگرچہ وہ پوری طرح صحت مند ہو چکا ہے لیکن اُسے لگتا ہے جیسے اس کا دھڑ پتھر ہو گیا ہو یا جسم سے الگ ہو کر اس کی رُوح ہَوا میں تیرتی پھرتی ہو اور حالانکہ اس قبر پہ جہاں اس کا گردن کے بغیر جسم دفن ہے اس کے نام کا کتبہ نہیں لگا ہوا ہے لیکن اُسے لگتا ہے جیسے ب کی بجائے وہ خود مر چکا ہے یا زندہ درگور ہو گیا ہے اور حالانکہ ب کے جسم کی لگام تھامے وہ جہاں چاہتا ہے اس کے پاؤں سے چلتا پہنچ جاتا ہے اور ب کے ہاتھ پاؤں اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتے ہیں پھر بھی اُسے اپنے ہاتھ پاؤں بہت یاد آتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ب کا جسم اس کے اپنے جسم سے زیادہ خوبصورت اور تر و تازہ ہے لیکن اُسے اپنے جسم کی یاد بہت ستاتی ہے اور وہ کئی بار ب کی ٹانگوں سے چلتا اس قبر پر بھی گیا ہے جہاں اس کے ہاتھ پاؤں اور جسم کے باقی اعضاء دفن ہیں کئی بار اس نے ب کے ہاتھ اٹھا کر اپنے ہاتھوں کے لئے فاتحہ خوانی بھی کی ہے۔

ہاتھ پاؤں کے علاوہ اسے اپنے کندھے بھی یاد آتے ہیں جن پر اس کا بیٹا جاوید بالکل اسی طرح سوار ہو جاتا تھا جیسے وہ ب کے جسم پر سوار ہے اسے اپنے پاؤں کی چاپ بھی بہت یاد آتی ہے جسے سُن کر ناہید کو اس کی دستک سے پہلے ہی اس کے آنے کا پتہ چل جاتا تھا اور ٹانگیں ـــ جن کو وہ برسوں جگہ جگہ لئے پھرا ـــ اور پیٹھ جسے وہ کئی برس تک آرام دہ بستر مہیا نہ کر سکا لیکن اسے سب سے زیادہ اپنے ہاتھ یاد آتے ہیں اور اسے ایسا لگتا ہے جیسے وہ اپنے ہاتھوں سے بچھڑ

کر ہی خود سے جُدا ہوا ہے ۔ جب وہ چھوٹا تھا تو ماں اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیتی آنکھوں سے لگاتی اور بار بار چُومتی تھی ۔ پھر اس نے ان ہاتھوں سے تختی لکھنا سیکھا ۔ ماسٹر نور محمّد سزا کے لئے ہاتھ نکالنے کو کہتے تو وہ ہاتھوں کو پُشت کی طرف چھُپا لیتا ۔ پھر اس نے ان ہاتھوں سے میٹرک کے امتحان کے پرچے حل کئے اور ضلع بھر میں اوّل رہا ۔ ان ہاتھوں سے اس نے کالج کے زمانے میں موٹی موٹی کتابوں کی ورق گردانی کی ۔ ناہید کے نام زندگی کے بہترین خطوط انہی ہاتھوں سے لکھے اور کئی بار اس کے ماتھے پر آئی ہوئی لٹ کو سُلجھایا ۔ جب اس کی ماں بیمار پڑ گئی تو وہ رات رات بھر اپنے ہاتھوں سے اس کا سر دباتا اور اُسے اپنے ہاتھوں سے دوا پلاتا ۔

اپنے ہاتھوں پر اس کی بیشمار یادیں نقش تھیں ۔ ہتھیلیوں پر اس کی قسمت کی لکیریں کھُدی ہوئی تھیں اور چھنگلی میں اس نے منگنی کی انگوٹھی پہنی تھی ۔ جس کے ننھے سے نگینے میں خوبصورت مناظر کی متحرک فلم چلتی رہتی تھی ۔

جب اُس نے آخری بار اپنے ہاتھوں سے معاہدے پر دستخط کئے تھے تو اپنے ہاتھوں اور بازوؤں کو بار بار چوُما اور آنکھوں سے لگایا تھا کاش اس کے اپنے جسم کا کوئی ایسا حصّہ باقی رہ جاتا جو آئینے کے بغیر دیکھا جا سکتا کاش کوئی ایک ہاتھ ہی اس کا اپنا ہوتا جو اُسے زندہ ہونے کا احساس دلاتا رہتا ۔

اُسے اپنے بائیں ہاتھ کی کٹی ہوئی انگلی جو کبھی اُسے بہت بدنما معلوم ہوتی تھی اور وہ محفلوں میں اسے چھپانے کی کوشش کرتا رہتا تھا ، بہت یاد آتی ہے ۔ اگر وہ کٹی ہوئی انگلی اُسے پھر مل جائے تو وہ ہر ایک کو فخر سے دکھائے اور کہے "دیکھو یہ میری اپنی انگلی ہے ۔"

مگر اب اُسے لگتا ہے اس کا اپنا کچھ نہیں ہے جیسے وہ کرائے کی گاڑی چلا رہا ہے پتہ نہیں کب اُسے اسٹیرنگ سے ہٹا دیا جائے اور وہ ہوا میں معلّق رہ جائے ۔ نجانے کب اس کے ہاتھ سے تب کے جسم کی مُہار چھوُٹ جائے اور وہ ہوا میں تیرنے لگے اور اس کی گردن کے نیچے خلا کے سوا کچھ نہ ہو ۔

راتوں کو اکثر وہ اپنے بے سَر کے جسم کو ہاتھ پھیلائے سڑکوں اور بازاروں میں ٹھوکریں کھاتے دیکھتا ہے۔ تیز رفتار موٹریں اس کے جسم کو کُچل کر آگے بڑھ جاتی ہیں تو وہ اُٹھ کر گردن کی تلاش میں پھر سے بھاگنا شروع کر دیتا ہے وہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا اور اُسے آوازیں دیتا ہے لیکن وہ ہاتھ پھیلائے دُور ہوتا جاتا ہے اور اس کے ہاتھ نہیں آتا، ہاتھ بھی تو اس کے اپنے نہیں ہیں۔ کبھی کبھی اُسے اپنے ہاتھ ہوا میں اُڑتے نظر آتے ہیں اور وہ بؔ کی ٹانگوں پر ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی اسے اچانک اپنے ہاتھ جسم سے الگ ہو کر سڑک کے کنارے پڑے ہوتے مِل جاتے ہیں تو وہ انہیں بؔ کے ہاتھوں کی مدد سے اُٹھا کر صاف کرتا اور آنکھوں سے لگاتا ہے۔

جب وہ ہوش میں آیا تھا اور مانگے ہوئے ہاتھ پاؤں میں پہلی بار حرکت ہوئی تھی تو صرف ایک بار بؔ کی بیوی نے اپنے شوہر کے ہاتھ کو بوسہ دیا تھا مگر وہ بوسہ ہاتھ پہ چپک کر رہ گیا تھا اور اُسے لگتا تھا جیسے وہ زخم کی طرح ہر وقت اس کے ہاتھ سے رِستا رہتا ہو مگر وہ ہاتھ اس کا کہاں تھا ——— وہ تو بؔ کا ہاتھ تھا اور بؔ کی بیوی کا اس پر زیادہ حق تھا۔ ہاتھ ہی نہیں اس نے تو بؔ کا پُورا جسم قرض لے رکھا ہے وہ کسی بھی وقت اپنا قرض واپس مانگ سکتی ہے مگر وہ معُاہدہ !

معُاہدہ اور نکاح کے فارم

اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ الف اور بؔ کی بیویوں میں سے کون بیوہ ہو چکی ہے بؔ کی بیوی اس پر قانونی حق نہیں رکھتی لیکن دراصل اس کے جسم پر اُسی کا حق ہے اور الف کی بیوی جو دراصل بیوہ ہو چکی ہے مُعاہدے کی رُو سے اب تک سُہاگن ہے۔

یہ عجیب بات ہے لیکن وہ کیا کر سکتا ہے اس کا تو جی چاہتا ہے کہ وہ رات کو بؔ کے کندھوں سے الگ ہو کر اپنے گھر چلا جائے اور بؔ کے بے سر کے جسم کو اس کے گھر کی طرف بھیج دیا کرے۔

اُسے اور بھی کئی طرح کی باتوں کی سمجھ نہیں آتی ——— مثلاً گواہی دیتے وقت بؔ کے ہاتھ پاؤں کا اس کے بارے میں کیا رویہ ہوگا اور خود اس کے اپنے ہاتھ پاؤں کس کی گواہی دیں گے۔

لیکن ان سب باتوں سے زیادہ اُسے ایک اور پریشانی نے گھیر رکھا ہے وہ ناہید کے ماتھے پر

آئی ہوئی لٹ سنوارنا چاہتا ہے تو اُسے لگتا ہے جیسے یہ لٹ وہ نہیں جب سنوار رہا ہے۔ ناہید
فرطِ محبّت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دباتی ہے تو اسے لذّت کی بجائے رقابت کا
احساس ہوتا ہے۔

وہ محبّت کے لمس کو ترس گیا ہے اور اسے شک ہے کہ بت کے دھڑ سے اس کی گردن جوڑتے
وقت وہ کوئی اہم اعصابی تار جوڑنا بھول گئے ہیں۔

خواب در خواب

" اور تم تین قسم کے ہو جاؤ گے :

سو جو داہنے والے کیسے اچھے ہیں اور جو بائیں والے ہیں کیسے بُرے ہیں ۔ اور جو اعلیٰ درجے کے ہیں وہ تو اعلیٰ درجے کے ہیں ۔

اور قرب رکھنے والے ہیں باغوں میں نعمت کے

ان کا ایک بڑا گروہ تو اگلے لوگوں میں سے ہوگا اور تھوڑے پچھلے لوگوں میں سے ہوں گے ۔

بیٹھے ہیں جڑاؤ تختوں پر تکیہ لگائے ان پر ایک دوسرے کے سامنے لئے پھرتے ہیں ۔ ان کے پاس لڑکے ۔ سدا لڑکے ہی رہنے والے آبخورے اور کوزے

اور پیالہ ستھری شراب کا

جس سے نہ سر دُکھے اور نہ عقل میں فتور آئے

اور میوہ جو نسا پسند کریں

اور گوشت اُڑتے ہوئے جانوروں کا جس قسم کا جی چاہے اور عورتیں گوری بڑی آنکھوں والیاں ۔ جیسے موتی کے دانے اپنے غلاف کے اندر بدلہ ان کاموں کا جو کرتے تھے ۔

نہیں سُنیں گے وہاں بکواس اور نہ گناہ کی بات

مگر ایک بونا سلام
اور داہنے والے کیا خوب داہنے والوں کے
رہتے ہیں ان باغوں میں جہاں بے خار بیریاں ہوں گی اور کیلے تہ بہ تہ
اور سایہ لمبا اور پانی بہتا ہوا
اور میوے بہت ختم نہ ہوں گے اور نہ ان کی روک ٹوک ہو گی
اور بچھونے اونچے اونچے۔
ہم نے اٹھایا ان عورتوں کو ایک اچھے اٹھان پر
پھر کیا ان کو کنواریاں
پیار دلانے والیاں
ہم عمر
واسطے داہنے والوں کے"

(الواقعہ) ______________

وہ توے کی طرح تپی ہوئی زمین پر جلدی جلدی پاؤں رکھتا اور آگے بڑھتا ہے۔

سب سے پہلے اُسے رشیدو مہترانی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے سر پر غلاظت سے بھرا ہوا ٹوکرا ہے۔ وہ ناک پر رومال رکھ لیتا ہے اور حیرت سے رشیدو کو دیکھتا ہے۔ وہ بدبو سے بے نیاز غلاظت کا ٹوکرا اٹھائے یوں گزر جاتی ہے جیسے بتاشے بانٹنے جا رہی ہو۔

پھر اسے بیرو ملتا ہے۔

بیرو کا باپ اس علاقے کا مشہور بھانڈ ہے۔ پہلے شادی بیاہ کے موقعوں پر اُسی کے توسط سے طوائفیں بلائی اور نچائی جاتی تھیں مگر اب بیرو ہی اس کا واحد سہارا ہے۔ لیکن بیرو ناچنا اور گانا نہیں چاہتا۔ گھنگھرو باندھ کر ناچتے گاتے اور بیاہ شادیوں اور عقیقوں پر بدھائیاں دیتے، ویلیں وصول کرتے۔ وہ جوان ہو گیا ہے اور اسے اپنی ہم عمر لڑکیوں کے سامنے ناچتے ہوئے شرم محسوس ہوتی

ہے۔ رات کو جب وہ زنانہ کپڑے پہن کر اور سُرخ رنگ کا دوپٹہ اوڑھ کر اپنے باپ کی سارنگی کی تال اور بھائی کے طبلے کی تھاپ پر ناچتا گاتا اور طوائفوں کی طرح بھاؤ بتاتا ہے تو گاؤں کے لڑکے اُسے "نی ہیرو" کہہ کر چھیڑتے ہیں اور وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے۔

وہ آگے بڑھتا ہے۔

اسے صادو ترکھان نظر تو نہیں آتا لیکن اس کی مخصوص کھانسی سنائی دیتی ہے۔ لکڑیاں چیر چیر کر اور برادہ پھانک پھانک کر اسے سُتّا کھانسی ہو گئی ہے۔ اسے جب بھی دورہ پڑتا ہے وہ تھوڑا سا گڑ چاٹ لیتا ہے۔

اور یہ بڑے ملک صاحب کا ڈیرہ ہے۔

مولوی ملک شیر کان پر ہاتھ رکھ کر بڑی خوش الحانی سے قصّہ سنا رہا ہے۔ نوجوان مولوی ملک شیر حال ہی میں درسگاہ سے فارغ التحصیل ہو کر آیا ہے اس کا ارادہ بھٹکے ہوئے لوگوں کو صراطِ مستقیم پر لانا تھا لیکن بڑے ملک صاحب نے اس کی ڈیوٹی سوہنا وزینی کا قصّہ سنانے پر لگا دی ہے۔

گاؤں سے باہر اسے بہت سے لوگ ملتے ہیں۔ اپنے وزن سے دگنا بوجھ اُٹھاتے ہوئے دھوپ اور گرمی میں کام کرتے، پتھر توڑتے اور چارہ کاٹتے ہوئے۔ وہ ان سب کو محبت بھری الوداعی نظروں سے دیکھتا آگے بڑھتا ہے اور اسے اپنے گاؤں کا آخری آدمی یا تی مسلی دکھائی دیتا ہے جو سِکر دوپہر میں بڑے میدان اور تالاب کے کنارے مرے ہوئے جانوروں کی ہڈیاں تلاش کرتا پھرتا ہے۔

وہ توے کی طرح تپی ہوئی زمین پر اور تیزی سے پاؤں رکھتا اور اٹھاتا گیٹ کی طرف بڑھتا ہے اور تقریباً بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوتا ہے۔ شکاری کتوں کی طرح اس کا پیچھا کرنے والے لُوکے تھپیڑے گیٹ پر آ کر رک جاتے ہیں۔ اندر دُور تک لمبی لمبی چمکیلی کاریں کھڑی ہیں۔ لان میں ڈرائیور ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے ایک دوسرے کے زخموں کو کرید رہے ہیں۔ وہ پانی سے بھرے ہوئے حوض کو ایک نظر دیکھتا ہے اور اس کا جی چاہتا ہے وہ اس میں تحلیل ہو جائے۔ وہ دوسرے گیٹ میں قدم رکھتا ہے۔

چاروں طرف خوبصورت پھولوں کے تختے ہیں۔ ہری بھری مخملی گھاس ہے اور زرق برق لباسوں میں خوب صورت عورتیں مرد آ جا رہے ہیں۔ وہ اندرونی دروازے پر پہنچتا ہے تو باوردی ملازم ادب سے دروازہ کھولتا اور جھک کر اسے سلام کرتا ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی دائیں یا بائیں کسی آنکھ کی پتلی ساکت ہو گئی ہے یا اپنی جگہ سے ہل گئی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے رشید دھیترانی سے لے کر باقی مسلّی تک سارے لوگ اور غلاظت کے ٹوکرے سے لے کر مرے ہوئے جانوروں کی ہڈیوں تک ساری چیزیں صاف اور ٹھیک دکھائی دے رہی تھیں مگر اب چیزیں فوکس نہیں ہو رہی ہیں اور اسے ایک کے دو اور دو کے چار نظر آنے لگے ہیں۔

میزبان خاتون بیگم شدّاد کے ساتھ ویسی ہی شکل و صورت کی ایک اور خاتون کھڑی نظر آتی ہے۔ دونوں کے بازو ایک جیسے چکنے اور ملائم ہیں۔ ہونٹ ایک جیسے رسیلے اور دونوں کی گردنوں میں ایک ہی طرح کے دمکتے ہوئے لاکٹوں نے اپنی طلائی بانہیں حائل کر رکھی ہیں اور وہ دونوں بار بار آپس میں اوور لیپ ہو جاتی ہیں۔

چیزوں کو آپس میں اوور لیپ ہونے سے بچانے اور انہیں اصلی حالت میں دیکھنے کے لئے اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اپنی ایک آنکھ بند کر لے اور جب دوسری تھک جائے تو پہلی آنکھ کھول لے۔

وہ اپنی ایک آنکھ بند کر لیتا ہے اور دوسری سے بہت سی چیزوں کو دیکھتا ہے۔ پردے خوشنما ڈیزائنوں کے۔

قالین نرم اور پھولوں والے جن پر چلتے ہوئے فخر و مسرت کا احساس ہوتا ہے۔

روشنیاں خوبصورت فانوسوں کی گود میں مسکراتی ہوئیں اور ائیر کنڈیشن کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، سیلنگ پنکھوں سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے ساگوان کے دروازے اور فرنیچر پالش سے چمکتے ہوئے، صوفے نرم والے آرام دہ۔ لڑکے خوبصورت وردیاں پہنے ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے جن میں مشروبات سے لبالب گلاس ہیں، اور بلوریں جام۔

مسکراہٹیں، خوش گپیاں، ہیلو ہیلو بولتے مسکراتے ہونٹ، کوکتی کوئلیں، چہکتی مینائیں،
گھگھو گھوں الاپتی فاختائیں اور غٹرغوں غٹرغوں کرتے کبوتر۔

رنگا رنگ ملبوسات، سوٹ، ٹائیاں، بیل باٹم، ساڑیاں اور میکسیاں جن میں خوشنما بروچ
جگمگاتے ہیں۔

آنکھوں میں جلتی قندیلیں، بینگیں جھولتی بالیاں، معطر زلفیں، دمکتے نگینے، لشکارے
مارتے لونگ، سگریٹوں کا خوشبودار دھواں اور دھوئیں کے مرغولے۔

بلاؤزوں، کرتیوں اور کھلے گلے کی قمیصوں سے جھانکتی مرمریں گولائیاں۔ پکوان اور میوے
طرح طرح کے اور بہت
اور مرغ سیخوں میں پروئے ہوئے

"سو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"

اس کی دیکھنے والی آنکھ تھک جاتی ہے تو وہ اسے بند کر لیتا ہے اور دوسری آنکھ سے بہت
سی چیزوں کو دیکھنا چاہتا ہے لیکن اسے کچھ نظر نہیں آتا۔

Scanned by CamScanner

رُکی ہوئی آوازیں

سب سے پہلے حمد اس رب کی جو معاف کر دینے والا اور بے حد مہربان ہے اور جو جانتا ہے سب کچھ ——!

دلوں کے اندر اور باہر

اور جس سے چھپی ہوئی نہیں ہیں خباثتیں اور منافقتیں

فتنہ و فساد کرنے اور نفاق ڈالنے والوں کی

بے شک وہی بچانے والا ہے اپنے بندوں کو

بدی اور شر کے عفریتوں سے

اور دیوانے کتوں سے

اور آدمی آدمی چٹنے بچھوؤں سے

جن کی سانسوں سے تعفن پھیلتا اور بادِ مشرق مسموم ہوتی ہے۔

اور وہی حکمرانی دیتا ہے زمین پر اور وارث بناتا ہے کمزوروں اور ناتوانوں کو جنہیں طبقات میں بانٹ کر کمزور کر دیتے ہیں فرعون۔

بے شک وہی تعریف کے لائق ہے۔

اور وہی ناتواں کو توانائی بخشنے والا ہے۔

اس کے بعد سُناتے ہیں تمہیں ایک قصّہ

اس عجیب شخص کا

جو بیٹھا رہتا تھا دن رات

سامنے ایک بڑے مکان کے

اور دیکھتا رہتا تھا اس کو محبت کے ساتھ

اور سُنتا تھا بہت اونچا

اور نہیں بول سکتا تھا ہرگز

کہ نہیں تھی اس میں بول سکنے کی قوت

اور کرتا تھا ساری بات اشاروں سے

اور پھر رو پڑتا تھا اپنی بے بسی پر۔ جب سمجھنے والا نہیں سمجھ سکتا تھا اس کی بات یا نہیں سمجھنا چاہتا تھا جان بوجھ کر۔

عذاب ان کے لئے نہیں ہے جو جانتے نہیں ہیں عذاب ان کے لئے ہے جو جاننا چاہیں تو جان سکتے ہیں مگر نہیں جاننا چاہتے اور نہیں جانتے اور عذاب ان کے لئے بھی ہے جو جانتے ہیں مگر نہیں مانتے اور رہ مصلحت کے کنوئیں سے باہر نکلنا چاہیں تو نکل سکتے ہیں مگر وہ نہیں چاہتے اور نہیں نکلتے اور جب لٹکاتے ہیں مسافر اپنی دستاریں ان کے لئے کہ وہ ان کو پکڑ کر باہر آجائیں تو وہ کھینچ لیتے ہیں ہر دستار نیچے۔ پھر ٹھٹھا کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ عنقریب ان کے غلیظ بدنوں کی بدبو دور تک پھیل جائے گی۔ اور کوئی نہیں آئے گا ان کی مدد کو۔

سو وہ ٹھٹھا کرتے اس کی حرکتوں پر اور نہ ڈرتے اپنے رب سے اور کہتے کہ بنایا ہے انہیں رب نے بہتر اور مکمل۔ اور دیا ہے حسن اور تندرستی اور مال کہ وہ اس کے حقدار تھے مگر وہ جو نہیں جانتے تھے ایسا۔

ترس کھاتے تھے اس شخص پر

جو پڑا رہتا تھا ایک جھونپڑی میں دن رات

اور گھورتا رہتا تھا اس مکان کو

جس کو تعمیر کیا تھا اس کے بزرگوں نے

اور وہ تھے بڑے صبر والے اور محنت کرنے والے

سو وہ ڈھوتے رہتے اپنی پیٹھوں پر

اینٹیں اور روڑے اور گارا اور چونا

اور جو جو سامان تعمیر کا درکار ہوتا

اور نہ پرواہ کرتے وہ سورج کی تمازت کی جب ان کے سروں پر چمکتا اور نہ ڈرتے

وہ سُن کر دینے والی ٹھنڈی ہواؤں سے۔

اور لگے رہتے کام میں شب و روز تاکہ بنائیں ایسا پختہ اور بڑا مکان جس میں خوشی

سے رہیں وہ

اور ان کے بچے

اور ان کے بچوں کے بچے

اور بچے رہیں موسم کی سختیوں اور تیز لیوں سے

سو وہ بناتے رہے ایک عظیم مکان، پرشکوہ عمارت اور اٹھایا اسے پختہ اور گہری

بنیادوں پر۔

تاکہ قائم رہے صدیوں تک اور نہ ڈگمگائے اور گرے بارشوں اور طوفانوں میں اور اس

میں شگاف نہ پڑیں ژالہ باری سے

اور انہوں نے بنیادوں کو محکم کیا خون اور پسینے سے

تاکہ ٹیڑھی نہ ہو جائیں محرابیں، فصیلیں اور منڈیریں

جب زلزلے آئیں

اور گڑگڑاہٹ سنائی دے

سو وہ بناتے رہے ساری عمارت مطابق اس نقشے کے

جو ملا تھا انہیں اپنے بزرگوں سے ورثہ میں

اور نہ سُنی انہوں نے حاسدوں کی بات جو کہتے تھے کہ عمارت نہیں ہے رہنے کے لائق۔

اور عذاب ان کے لئے بھی ہے جو ہمہ وقت ٹوہ میں رہتے ہیں دوسروں کی کمزوریوں کی اور عیب جوئی کرتے ہیں دن رات مگر نہیں دیکھتے اپنی طرف اور کہتے ہیں تندرستوں سے کہ وہ ہیں بیمار اور معذور۔ اور ایسے لوگوں کے لئے اللہ نے آگ بھڑکا رکھی ہے۔

اور عذاب ان کے لئے بھی ہے جو دیتے ہیں کورے کاغذوں کے تعویذ اور نہیں کرتے علاج ـــــ مگر دیتے ہیں جھوٹی تسلیاں بیماری اور رنج سے نجات حاصل کرنے کی۔

مگر وہ رنجیدہ نہ ہوئے حاسدوں کی بات سے اور طعنوں سے

اور بنایا خوب صورت عالیشان مکان

سامنے اس بچے کی آنکھوں کے

جو بڑا ہو کر سسکیاں بھرتا تھا۔

اور مکان کی حالت دیکھ کر کڑھتا تھا

مگر وہ تھا بے بس اور ناتواں

اور وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے

پاس اپنے رب کے جو سب کا پلنے والا اور مارنے والا ہے

اور جسے چاہتا ہے اپنے پاس بُلا لیتا ہے

سو اس نے بلا لیا اس کے باپ دادا کو باری باری

اور چھوڑ دیا بے آسرا اس کو ـــ جس کی آنکھوں کے سامنے تعمیر کیا گیا تھا

مکان بے شک اللہ نہایت حکمتوں والا اور رازوں کو جاننے والا ہے۔

پس جب وہ رہ گیا اکیلا

تو اسے لے لیا اپنی سپردگی میں

ان لوگوں نے

جو دعویٰ رکھتے تھے دوستی کا اور بھائی چارے کا

اس سے اور اس کے باپ دادا سے

اور وہ کہتے تھے کہ وہ پرورش کریں گے اس کی۔

اور نگہداشت رکھیں گے مکان کی

اور نہ لیں گے کوئی چیز عوض اس کے بجز نیکی کے

اور دعوے کرتے تھے کہ وہ دستبردار ہو جائیں گے۔

اور چھوڑ دیں گے مکان

بعد بچے کی بلوغت کے

مگر وہ پھر گئے اپنے وعدوں سے

اور وہ تھے خود غرض

انہوں نے کھانے کو دیا بہت تھوڑا اور نہ بولنے دیا کسی بات پر اور منحرف ہو گئے

ان وعدوں سے جو انہوں نے کئے تھے ان سے جو اب قبروں میں لیٹے تھے گہری نیند۔

اور عذاب ان کے لئے بھی ہے جو نہیں پہچانتے زندوں کو مگر پھول چڑھاتے ہیں قبروں

پر اور یاد کر کے روتے ہیں ان کو جو اپنے وقت میں نہ پہچانے جانے کے صدمے سے مر

گئے تھے۔

سو انہوں نے روگردانی کی ان لفظوں سے جو انہوں نے ادا کئے تھے اپنی زبانوں سے۔

اور کھاتے تھے یتیم کا مال

مگر نہیں بولنے دیتے تھے اسے ہرگز۔

اور سخت عذاب ہے ان کے لئے جو بے حرمتی کرتے ہیں معصوم لفظوں کی۔ اور لذت کی سیخوں میں پرو کر بے خطا لفظوں کو بھونتے ہیں۔ ہوس کے انگاروں پر اور بیچ دیتے ہیں خوشبو کو عوض پتھروں اور مردہ گوشت کے۔ اور زیاں کرتے ہیں کاغذ اور سیاہی کا اور اپنی تحریر کی ہوئی سطروں کو پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں اور اللہ پسند نہیں کرتا سیاہی اور کاغذ کے زیاں کو کہ جس سے فروغ دیا جا سکتا تھا آسمانی کتابوں اور زمینی محبتوں کے قصوں کو

سو انہوں نے انحراف کیا ـــــ اور پھر گئے اپنے وعدوں اور لفظوں سے

اور دی اسے ایک روٹی۔

جسے لگی تھی سخت بھوک تین روٹیوں کی

اور وہ دبلا ہوتا چلا گیا۔

اور کہاں سے آتی اس میں قوت اور سکت۔

احتجاج کرنے کی

اور اپنا حق مانگنے کی

اور وہ شخص بھول گیا بولنا

اور اسے پتہ نہیں چلتا تھا کس طرح کرتے ہیں کلام

مگر اللہ جانتا ہے دلوں کے بھید

آخر چلے گئے وہ لوگ

بعد کئی برسوں کے چھوڑ کر مکان

مگر وصول کر لی انہوں نے پگڑی

اور ظاہر کرتے تھے خود کو اصل وارث

حالانکہ نہیں تھے وہ اصل وارث

اور وہ بول نہیں سکتا تھا کہ اسے نہیں سکھایا گیا تھا بولنا۔
نہ اجازت دی گئی تھی اس کی
اور وہ رہ گیا نٹے مالکوں کے درمیان
اور وہ اسے ڈال دیتے تھوڑا سا کھانا علیحدہ برتن میں
اس کی بھوک کا ایک چوتھائی
اور وہ کھا لیتا اکثر چرا کر
راتب بجس چوپائے کا
اور چن لیتا مرغیوں کے آگے سے دانہ دنکا
اور پی لیتا بہت سا ٹھنڈا یا گرم پانی
اور کمی پوری کر لیتا خوراک کی۔ تاکہ زندہ رہے اور دیکھتا رہے اس عمارت کو۔ جو اس کے
باپ دادا نے بنائی تھی
اور سناتے ہیں تمہیں قصہ اس عمارت کا
جو بنائی گئی تھی بڑی عالیشان
دو منزلہ
اور جس کا اصل وارث اسے حسرت سے تکتا رہتا تھا
پھر چلے گئے وہ لوگ بھی
اور لے گئے ساتھ اکھاڑ کر
مکان کی اوپر والی منزل
اور نیلام کیا بہت سا ملبہ
مگر وہ بول نہیں سکتا تھا اور نہ کر سکتا تھا کلام
اور نہ ہی اس میں جھگڑا کرنے کی سکت تھی

سو وہ دیکھتا رہا پاس کھڑا

اور روتا رہا اندر ہی اندر

اور خرید لیا باقی کا حصہ دوسرے لوگوں نے جو کم ظالم نہیں تھے اگلوں سے

سو انہوں نے نکال باہر کیا اسے

مگر دے دیتے تھے وہ بھی ایک روٹی

بجائے تین کے

پیاز کی گٹھلی کے ساتھ

مگر نہیں کرتا تھا وہ شکوہ کسی سے

اور بے شک وہ کر نہیں سکتا تھا اگر چاہتا بھی۔

مگر وہ رو سکتا تھا

اور روتا تھا۔ دیکھ دیکھ کر اکھڑی ہوئی اینٹوں کو

اور ٹوٹی ہوئی منڈیروں کو

اور وہ دیکھ بھال اور مرمت نہیں کرتے تھے مکان کی

اور نہ تھی انہیں کچھ محبت اس سے

پھر چھوڑ دیا اس نے کھانا اور پینا

اور پھینک دیتا باسی روٹی کوڑے پر

اور پیاز کی گٹھلی کو ٹھوکر مارتا پاؤں سے کہ دور جا پڑے اس سے

اور بھر لیتا پیٹ اڑنے والے پرندوں کے شکار سے

اور اللہ نے وافر کیا اس کے لئے شکار درختوں پر اور جھاڑیوں میں

اور مل جاتے نہایت لذیذ پھل۔ اور وہ نکال لیتا اپنے لئے کوئی نہ کوئی راستہ جب اسے

بھوک لگتی

اور دردناک عذاب ہے ان کے لئے جو بیٹھ جاتے ہیں راستوں میں گھنی چھاؤں دیکھ کر
اور راستہ نہیں دیتے چلنے والوں کو
پھر جب وہ نکال لیتے ہیں نیا راستہ تو حسد کرتے اور برا بھلا کہتے ہیں چلنے والوں کو۔
اور نہیں جانتے کہ عنقریب ان کے غلیظ بدنوں کی بدبو دور تک پھیل جائے گی۔

سو وہ نکال لیتا کوئی راستہ پیٹ بھرنے کا
اور بحال ہونے لگیں اس کی تمام قوتیں
اور وہ سننے لگا
آہٹیں اور آوازیں
اور پرندوں کا شور
اور بادل کے گرجنے کی آواز
اور جمع ہونے لگیں اس کے اندر آوازیں
اور برسوں کی رکی ہوئی باتیں
اور مچلنے لگے غصے اور جوش کے جذبات
اور پھٹنے لگا اس کا سینہ
رکی ہوئی باتوں اور آوازوں کے شور سے
اور سنا دیا ہم نے تمہیں ایک دلچسپ قصہ۔ اس شخص کا
جو ایک روز بادل کی طرح گرجے گا اور لرز جائیں گے
وہ سب اس کی آواز سن کر
جس میں برسوں کی رکی ہوئی چنگھاڑ ہو گی۔

۱۹۷۸ء کا آخری افسانہ — پناہ

اسے پتہ نہیں چل رہا کہ وہ کن لوگوں کے ساتھ کدھر جا رہا ہے؟ شاید کوئی جلوس ہے —
مگر وہ کب اور کیسے جلوس میں شامل ہوا اسے کچھ یاد نہیں آ رہا۔ کیا پتہ اس کی بیوی دردِ زہ سے کراہ
رہی ہو اور وہ ڈاکٹر کو بلانے یا ایمبولینس لانے کے لئے گھر سے نکلا اور جلوس میں شامل ہو گیا ہو —
مگر یہ کیسا جلوس ہے کہ سب چُپ ہیں کہیں سے زندہ یا مُردہ باد کے نعروں اور گولیوں کی آواز سنائی
نہیں دے رہی ہے شاید نعرے لگانا منع ہے مگر گولیاں؟

اسے چھینک آجاتی ہے مگر وہ روک لیتا ہے اور زور زور سے ناک ملتا ہے اس کی ناک اور
آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اسے لگتا ہے چھینک روکنے سے زیادہ تکلیف دہ بات اور کوئی نہیں اور
چھینک آجائے تو چھینک لینے سے بڑھ کر کوئی راحت نہیں۔ وہ باہر کی چُپ سے اُکتا کر اندر جھانکتا
ہے، کیا دیکھتا ہے کہ اندر کے لوگوں نے بھی جلوس نکالا ہے۔

"ہمیں چھینکنے دو — ہمیں کھانسنے دو، ہمیں کھجلانے دو ہمیں۔"

وہ سر اٹھا کر دیکھتا ہے شہر کی بڑی سڑک ہے دونوں جانب عظیم الشان عمارتیں ہیں کئی کئی منزلہ ہوٹل —
ایئر کنڈیشنڈ ریستوران اور بیکریاں۔ سیلف سروس شاپنگ سینٹرز — سُپر مارکیٹیں۔ آرائش اور
زیبائش کے سامان سے لبالب بھری دکانیں۔ لمبی چمکیلی کاریں، ہنستے مسکراتے خوش جمال، خوش حال
اور فارغ البال لوگ — لگتا ہے ان کی لاٹریاں نکل آئی ہیں۔ اس کے اندر کھلنے والی آنکھ وا

ہو جاتی ہے۔

"ہماری لاٹری کیوں نہیں نکلتی؟"

"پرائز بانڈ پر پہلا انعام کیوں نہیں نکلتا؟"

"ہمارے معموں میں غلطیاں کیوں رہ جاتی ہیں؟"

وہ اندر کھلنے والی آنکھ بند کر لیتا ہے اور آرائش و زیبائش کے سامان سے لبالب بھری دکانوں کا جائزہ لیتا ہے دکانوں کے اندر باہر خریداروں کا ہجوم ہے شہر کے ہر کونے سے گاہک ٹوٹے پڑتے ہیں۔

وہ فٹ پاتھ پر چنے بیچنے والے کو کندھے پر بہنگی اٹھائے گاہکوں کی تلاش میں پھرتے دیکھتا ہے، موت اور گاہک کا کیا پتہ کب اور کہاں آ جائے۔ وہ چوک سے سینما تک بہنگی اٹھائے بار بار چکر لگاتا ہے مگر گاہک نہیں ملتا شاید سب لوگ لذیذ اور مرغن کھانے کھا کر آئے ہیں یا کھانے جا رہے ہیں۔ بچوں کے منہ چیونگم، ببل گم اور لولی پاپ سے فارغ نہیں ہیں۔ اسے جلدی ہے مگر گاہکوں کو جلدی نہیں ہے۔ گھر میں اس کی بیوی کئی برس سے دردِ زہ سے تڑپ رہی ہے۔ اس کی جوان بہن کا جسم جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے لباس سے جھانکتا ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی کھلونے مانگتے مانگتے اور روتے روتے سو گیا ہے۔ وہ چنے بیچنے والے کے اخراجات اور آمدنی کا حساب جوڑتا ہے مگر پریشان ہو کر ادھورا چھوڑ دیتا اور دوبارہ جلوس میں شامل ہو جاتا ہے۔ جلوس میں شامل لوگ ماتم کرتے جا رہے ہیں۔

"ہماری فصلوں کو نظر نہ آنے والے سؤر تباہ کر دیتے ہیں۔"

"ہماری گایوں بھینسوں کے شکم چارے سے پر اور تھن دودھ سے خالی ہیں۔"

"ہماری مرغیاں پتھریلے انڈے سیتی سیتی ہلکان ہو گئی ہیں۔"

"ہمارے سروں پر شکر دوپہر تن گئی ہے اور ڈھلنے کا نام نہیں لیتی۔"

"ہمارے گھروں پر ہماری مرضی کے خلاف دکھوں نے بستر لگا لئے ہیں۔"

اسے پتہ نہیں چل رہا کہ وہ کون لوگ ہیں اور وہ ان کے ساتھ کیوں ہے اچانک اسے خیال آتا ہے کہ کیا پتہ جلوس نہ ہو جنازہ ہو جنازہ! ؟

اسے جھرجھری سی آجاتی ہے مگر کس کا؟

کیا پتہ اس کا کوئی عزیز دوست یا قریبی رشتہ دار فوت ہو گیا ہو اور صدمے کی وجہ سے اس کا ذہن معطل ہو کر رہ گیا ہو مگر لوگوں نے چمکیلے اور بھڑکیلے لباس کیوں پہن رکھے ہیں شاید ان کی لاٹری نکل آئی ہے۔ان کو پرائز بانڈ یا معمے پر پہلا انعام ملا ہے۔انہوں نے غبارے پھلانے، ٹائیاں باندھنے اور کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کیلے کھانے کے مقابلے جیتے ہیں۔

ٹھیکے، ایجنسیاں، آڑھت، نیلام اس کے اندر لفظوں کی مکھیاں بھنبھنانے لگتی ہیں۔اندر والے لوگ سروں پر بازو رکھ کر قریب سے گزرتے ہیں اور پکار پکار کر کہتے ہیں۔

ہمیں ہمارے سوتیلے باپوں نے عاق کر رکھا ہے۔"

"ہمارے سروں پر آسمان تھا اس میں شگاف کر دیا گیا ہے ہمیں اس شگاف سے ڈر لگتا رہتا ہے۔"

"ہماری زبانیں ذائقوں کے لئے ترستی ہیں اور ذائقوں کے تعاقب میں ہمارے پاؤں لہولہان اور جسم تار تار ہو گئے ہیں۔"

وہ گھبرا کر اپنے اندر کی جانب کھلنے والی آنکھ بند کر لیتا ہے اور ہجوم پر ایک نگاہ دوڑاتا ہے۔ اچانک اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے شاید وہ کسی چیز پر سوار ہے یا ہوا میں معلق ہے۔اسی لمحے کہیں قریب ہی سے بینڈ کی آواز سنائی دیتی ہے۔کیسے سنگ دل لوگ ہیں وہ سوچتا ہے جنازے کے ساتھ بینڈ لے کر چلتے ہیں مگر شاید یہ جلوس یا جنازہ نہ ہو— برات ہو— مگر کس کی؟

ممکن ہے اس کے کسی ہمسائے یا دفتر کے کسی ساتھی کا بیاہ ہو رہا ہو۔کئی دنوں سے ہر طرف شادیاں ہو رہی ہیں۔ لوگ جلدی جلدی خوشیاں منا لینا چاہتے ہیں۔ہر گلی محلے میں باراتیں اتری ہیں، دیگیں چڑھی ہیں اور قورمے، پلاؤ اور زردے کی خوشبوئیں راہ چلتے لوگوں پر آوازے کستی ہیں۔

جہیز کے سامان سے لدی ہوئی لاریاں سڑکوں پر بغلیں بجاتی پھرتی ہیں مگر دولہا کہاں ہے ؟

اسے کچھ صاف نظر نہیں آتا آنکھوں کے سامنے دھندسی ہے شاید عینک کے شیشوں پر گرد جم گئی ہے۔ وہ رومال نکال کر گرد صاف کرنا چاہتا ہے مگر بہت دیر تک ٹٹولنے کے بعد بھی عینک نہیں ملتی تو اسے یاد آتا ہے کہ وہ عینک نہیں لگاتا۔

اپنی آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی دھند کو ٹٹولتے ٹٹولتے اس کے ہاتھ میں سہرے کی لڑیاں آجاتی ہیں وہ حیرت سے اُچھل پڑتا ہے یہ کیسے ہوگیا ؟ اسے بالکل یاد نہیں آرہا کہ وہ کب کھارے چڑھایا، دولہا بنایا اور گھوڑی پر سوار کیا گیا شاید ان سے غلطی ہوئی ہو !

بیاہ شادیوں کے اس موسم میں جب ہر طرف باراتیں آجارہی ہیں ممکن ہے کسی بارات کا دولہا کھو گیا ہو اور انہوں نے غلطی سے یا جان بوجھ کر اسے اس کی جگہ بٹھا دیا ہو۔ پتہ نہیں دولہا بننے سے پہلے وہ کسی ضروری کام سے کہیں جارہا ہو ؟ کیا پتہ گھر میں مہمان آئے ہوں اور وہ ان کے لئے سوڈے کی بوتلیں لینے نکلا ہو یا اس کی بیوی درد زہ سے ......

اچانک اسے خیال آتا ہے کہ کیا پتہ ابھی تک وہ غیر شادی شدہ ہو اور سچ سچ اس کی شادی ہورہی ہو مگر کس سے ؟ اس کی نگاہوں کے سامنے ایک گلاب بدن اگ آتا ہے اور شیر کے دھاڑنے کی آواز سنائی دینے لگتی ہے۔

کیا دیکھتا ہے کہ میٹھے پانی کا ایک چشمہ ہے جس کے قریب ننگی تلوار کا پہرہ ہے۔ وہ چشمے کے کنارے پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے۔ اس کے اُجلے پاؤں کو چھو کر گزرنے والے پانی کا ہر ریلا پلٹ پلٹ کر اسے دُور تک دیکھتا جاتا ہے۔ وہ شیر کی کھال پہن کر جھپٹنا چاہتا ہے لیکن وہ اسے منع کر دیتی ہے۔

بڑے چوک پر پہنچ کر ایک اور بارات دکھائی دیتی ہے

کار کی فرنٹ سیٹ پر دو سانپ آنکھوں والا دولہا کنڈل مارے بیٹھا اس کی طرف دیکھتا اور پھن پھیلا کر معنی خیز انداز میں مسکراتا ہے۔ بینڈ والے غمگین دُھن بجاتے ہیں شاید انہیں نہیں

بتایا گیا کہ وہ جنازے کے ساتھ نہیں۔ بارات کے ساتھ ہیں ۔

دوسری بارات قریب سے گزر جاتی ہے مگر اس کی بارات بڑے چوک پر رکی ہوئی ہے۔ مشرق مغرب، شمال، جنوب چاروں طرف سڑکیں جاتی ہیں مگر کسی کو پتہ نہیں کہ اسے کون سی سڑک پر جانا ہے اور کس طرف مڑنا ہے۔ بینڈ والے باراتیوں سے اور باراتی اس سے راستہ پوچھتے ہیں وہ سہرے کی لڑیاں ہٹا کر دیکھتا ہے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا وہ گھبرا کر ایک طرف کو چلنے کا اشارہ کر دیتا ہے اور برات اس جانب والی سڑک پر مڑ جاتی ہے ۔

آہستہ آہستہ اس کا ذہن صاف ہوتا جا رہا ہے وہ باراتیوں کو پہچاننے لگا ہے۔ یہ تایا ہے، وہ ماموں ہے، یہ چچا کا بیٹا ہے، وہ ہمسایہ ہے، اس کے ابا کا ایک ہم شکل ہجوم پر پیچھے سے ریزگاری کا مینہ برساتا ہے۔ بھکاری لڑکے ریزگاری چننے کے لئے ایک دوسرے پر گرتے اور ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہیں۔ سڑک کے دونوں جانب جگہ جگہ ٹریفک رکا ہوا ہے دکاندار دکانوں کے تھڑوں پر کھڑے ہو کر سامنے کے چوباروں کی کھڑکیوں اور بالکونیوں کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ اس کے اندر والی آنکھ پھڑکتی ہے اور کھلنا چاہتی ہے مگر وہ اسے کھلنے نہیں دیتا۔

سڑک ختم ہو جاتی ہے اور بارات پھر رک جاتی ہے۔ بینڈ والے باراتیوں کی طرف اور باراتی اس کی طرف دیکھتے ہیں۔ اس کا ذہن صاف ہو چلا ہے۔ وہ کچھ دیر سوچتا ہے پھر بائیں ہاتھ والی گلی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بارات گلی میں داخل ہوتی ہے۔ دونوں جانب اونچے اونچے خوب صورت مکانات ہیں۔ بچے، بوڑھے، عورتیں، مرد، بارات دیکھنے کے لئے باہر نکل آتے ہیں۔ مکانوں کے چھجوں، بالکونیوں اور چھتوں سے عورتیں جھانکتی ہیں، سامنے ایک جگہ شامیانے نظر آتے ہیں۔ دیگیں چڑھی ہوئی ہیں اور ساری گلی میں روح کیوڑا کی خوشبو اتراتی اتراتی پھرتی ہے۔ لڑکی والے بارات کا استقبال کرتے ہیں۔ سب سے پہلے اسے، اس کے بعد شہ بالا کو اتارا جاتا ہے۔ ساری گلی باراتیوں سے بھر جاتی ہے۔ اتنی بڑی بارات لوگوں نے شاید ہی پہلے کبھی دیکھی ہو۔ آدھی بارات کو شامیانے کے نیچے اور آدھی بارات کو ایک بہت بڑے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں لایا جاتا ہے۔ وہ گردن جھکائے ــ

سہرے کی لڑیوں میں منہ چھپائے شرمایا اور گھبرایا گھبرایا سا دوستوں اور ہم عمروں کے درمیان صوفے پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے باراتی کرسیوں پر بیٹھ کر سوڈے کی بوتلیں اور شربت پیتے ہیں۔ وہ شرما رہا ہے۔ اسے پیاس لگی ہے۔ شربت کا گلاس اس کے سامنے رکھا ہے مگر وہ پی نہیں سکتا۔ اسے کھانسی آتی ہے مگر وہ کھانس نہیں سکتا۔ وہ چھینکنا چاہتا ہے مگر چھینک نہیں سکتا۔

"ہمیں چھینکنے دو ——— ہمیں کھانسنے دو۔ ہمیں"

اس کے اندر سرگوشیاں ابھرتی ہیں مگر وہ انہیں دبا دیتا ہے۔

لڑکی والوں کو پتہ نہیں کیوں نکاح پڑھنے کی جلدی ہے وہ مولوی صاحب کو پکارتے ہیں۔

مولوی صاحب بغل میں نکاح کا رجسٹر دبائے لاٹھی ٹیکتے باہر کے دروازے کی بجائے گھر کے اندر والے دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور اس کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں:

"فرمایئے کس سے ملنا ہے؟"

"جی" ۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

کیا دیکھتا ہے کہ بھائیں بھائیں کرتا وسیع و عریض ڈرائنگ روم ہے اور وہ اس کے باپ کے سامنے اکیلا کھڑا ہے۔

محمد منشا یاد بنیادی طور پر THREE DIMENSIONAL PERCEPTION کا افسانہ نگار ہے اس کے ہاں ساری جہتوں اور سمتوں کا اعتبار قائم ہے کسی ماہر بُت تراش کی طرح وہ خارج سے باطن کی بازیافت کرتا ہے۔ یوں اس کے افسانے یکطرفہ اور یک رُخ حقیقتوں کے احوال نہیں بلکہ تجرید کے لمس اور علامتوں کی تدبیر کاری کے باوجود زندگی کی بھرپور شیئیت سے لبالب دوطرفہ جنسی شراکت کے عکس نما ہیں۔ جن میں وہ تیسرا رُخ بھی شامل ہو جاتا ہے جس کی روشنی میں سوئی اور زندگی سے عاری اشیاء جیتے سانس لینے لگتی ہیں۔ پس منظر کی مجرد اندھی گلیوں میں کھوئے کرداروں کو اس نے افسانے کی دنیا میں نئے سیاق و سباق کے ساتھ بحال کیا ہے۔ بحال ہی نہیں کیا ان گونگے بہرے لوگوں کو زبان دی ہے۔ یہ امر اس لئے ارتکاز مانگتا ہے کہ ہمارے عہد میں ادراک کا میدان سکڑ رہا ہے۔ زمان و مکان میں دراڑیں ابھر رہی ہیں۔ سائیکی اور سوسائٹی دو اجنبی اور لاتعلق صورتیں ہیں سمتیں اور جہتیں اضافیت کے گھیرے میں ہیں اور حرکتیں ـــــ خواہشیں سراب ہیں، منزلیں نایاب ـــــ ہمارے بہت سے افسانہ نگار اس بڑھتے ہوئے ویسٹ لینڈ میں گرفتار ہیں اس بنتے بگڑتے تناظر میں محمد منشا یاد نے ایک تسلسل کا ایقان فراہم کیا ہے۔ ہمارے مالیخولیاتی عمل کو حرکت کی نوید دی ہے۔ ماورائیت، داخلیت، فلیش بیک، کایا کلپ صورتحال اور شعور کی رو ایسے پیٹرنز میں لکھنے کے باوجود اور باوصف، اس کے افسانوں میں ہمارے لمحوں کے رابطے موجود، زندگی کا حوصلہ سلامت اور دھرتی کا قیام ملتا ہے۔ ماس اور مٹی اسی بصیرت اور بصارت کی علامتی اور اردو افسانے میں تجربے کے استحکام کی پیش رفت ہے خود کلامی سے ہم کلامی کی طرف سفر ہے۔

اقبال آفاقی ـــــــــــــــــــــــ

منشا یاد خود کو دوسروں کی جگہ پر رکھ کر دیکھ سکنے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے کردار بہت تھوڑی وضاحت سے مکمل طور پر متعارف ہو جاتے اور قاری کے دل و دماغ پر اپنا بھرپور تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔ فرسودہ قدروں کو توڑنے اور بدلتے ہوئے حالات میں انسانی عظمت کی گواہی دینے والی نئی قدروں کی تخلیق کے دوگونہ عمل نے منشا یاد کے افسانوں کو صورت واقعہ کی عکاسی سے بہت آگے نئے جہانوں کی نمود کا اعجاز عطا کر دیا ہے۔

محمد منشا یاد اردو کا منفرد افسانہ نگار ہے وہ جدید ہے مگر اس کے نزدیک جدت ابلاغ کی

ذمہ داریوں کو تج دینے کا نام نہیں۔ وہ اسلوب کی نُدرت کے جنون میں اجنبھا نہیں پیدا کرتا اس کی تجریدی مشاہدے کے دیوالیہ پن کا پردہ نہیں ہوتی۔ وہ معاشرتی انتشار اور قدروں کی توڑ پھوڑ کو جواز بنا کر بے معنویت کا زہر نہیں پلاتا۔ وہ مخصوص مقاصد کے تحت ادبی ورکشاپوں میں ڈھالی گئی تحریکوں کے کارکن ادیبوں کی دوڑ میں شامل نہیں ہوتا بلکہ اپنے فن کی آبیاری اپنے اندر کے سچے تخلیقی سرچشمے سے کرتا ہے۔

اس کے کردار اپنے معاشرے کے اقتصادی، تاریخی، ثقافتی اور مابعدالطبیعاتی عوامل سے جنم لینے والی مرکب فضا میں سانس لیتے ہیں۔ وہ اپنے قاری کو پوری طرح اعتماد میں لیتا اور اس کے دل میں ایک سچے اور دردمند فن کار کے طور پر اپنی بلند وقاری کا تابناک نقش قائم کرتا ہے۔

جلیل عالی ______

محمد منشا یاد، جدید اردو افسانے میں ایک معتبر اور منفرد نام ہے۔ ان کے افسانوں کا خمیر زندگی ــــ بالخصوص پاکستان کے دیہاتی اور شہری عوام کی معاشرتی زندگی سے اٹھا ہے۔ اسی لئے ان کے کردار اپنے خارجی اور داخلی احوال کے ساتھ متحرک اور منفرد شکلوں میں ابھرتے ہیں۔ تحرک اور انفرادیت کی مختلف شکلوں کے اس کُل میں ہماری نئی پرانی تہذیب، لوک دانائی اور جدید شعور کے ساتھ فنکارانہ بازیافت حاصل کرتی ہے مگر بازیافت کے اس عمل میں ان کے ہاں ماضی اور لاشعور کے جنگلوں میں پناہ گزینی کا رویّہ نہیں بلکہ وہ تو ان جنگلوں کی کاٹ چھانٹ کرتے ہوئے اپنے اجتماعی اور انفرادی خوابوں کے ہمراہ موجود سے ناموجود کی جانب سفر پر ابھارتے ہیں ایسا ناموجود جو ہمارے عصر اور معاشرے کا سچا امکان ہے۔ ان کے افسانوں میں سوچ سبھاؤ کی فضا اور لہجے کی معصومیت سے تشکیل پانے والا خاص دھیما پن اونگھتے ہوئے فکر و احساس کے لئے نیند آور تھپکیوں کا نہیں، پیار سے جگانے والے ٹھوکوں کا تاثر رکھتا ہے۔ ان کا پیرایۂ اظہار علامتی ہو یا بیانیہ، موضوع اور رویّے کی یہ حقیقت پسندی فنی طور پر "نثری نظم" یا جواب مضمون نہیں بننے پاتی بلکہ کہانی کے رشتے سے نمودار ہوتی ہے انہی اوصاف سے "ماس اور مٹی" اردو افسانے کی موت کے خالی ڈھنڈورے میں زندگی کے سچے اعلامیے کی حیثیت رکھتی ہے۔

یوسف حسن ______

بند مٹھی میں جگنو

(دوسرا ایڈیشن)

مکتبۂ شاہکار۔ کلفٹن کالونی۔ لاہور

محمد منشا یاد